محسنین اُردو
(مصور)



مرتب:

الحاج سید مرتضیٰ حسین بلگرامی زیدی الواسطی

محسنین اُردو
(مصور)



مرتب

الحاج سید مرتضیٰ حسین بلگرامی زیدی الواسطی

Mohsineen-e-Urdu

Syed Murtaza Husain Bilgrami

نام کتاب	:	محسنین اُردو (مصور)
مرتب	:	الحاج سید مرتضیٰ حسین بلگرامی زیدی الواسطی
سال طباعت	:	۲۰۱۴ء
تعداد	:	۵۰۰
قیمت	:	۱۵۰ روپئے
کمپوزنگ	:	مشکوٰۃ کمپیوٹرس، علی گڑھ
ناشر	:	بک سینٹر، فاطمہ منزل، ڈگی روڈ، علی گڑھ

ملنے کے پتے

مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ

ایجوکیشنل بک ہاؤس، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ

مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، اُردو بازار، جامع مسجد، دہلی

معنون

نامورانِ بلگرام کے نام

فہرست

قلبی تعلق نامہ

بلگرامی ۔تمہارے قلمی نگارشات، صلاحیت اور علمیت کا تو بہت پہلے سے قائل تھا۔مگر ادھر تمہارے مضامین نئی کتاب، تہذیب الاخلاق، غالب نامہ میں پڑھ کر مسرت ہوتی تھی۔رسالہ کتاب نما تو تمہارا افدائی تھا۔ادھر تم نے ادیبوں اور شاعروں کے قلمی سوانح کی طرح ڈالی ہے۔وہ خاصہ نایاب کام تھا اور ہے۔کیسے کیسے پاپڑ تم نے بیلے ہیں، مجھے اس کا احساس ہے اور یہ تمہارا اردو پر احسان عظیم ہے۔ورنہ ذاکر صاحب، یوسف حسین، محمود حسین، رشید احمد صدیقی اور، مشفق خواجہ، پروفیسر اسلوب احمد انصاری، صالحہ عابد حسین، عصمت چغتائی اور شمس الرحمٰن فاروقی، شوکت تھانوی اور سردار جعفری، ساحر لدھیانوی، پروفیسر عابد حسین کی مختصر سوانح عمریاں کہاں میسر آسکتی تھیں؟

اب تم نے ''محسنین اُردو مصور'' کے واسطے سے مختصر حالات کی اشاعت کا نظم کیا۔میری اور اُردو داں طبقہ کی دلی مبارک باد قبول کرو۔پھر تن تنہا تم نے اس عظیم کام کو انجام دیا۔تم لائق افتخار ہو۔خدا کرے یہ ''محسنین اردو مصور'' بہتوں کے کام آئے۔

تمہارا

شاہد علی خاں

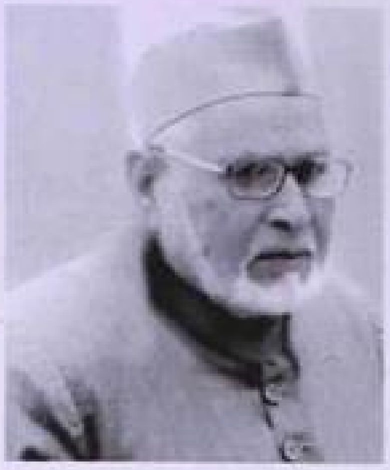
مدیر

''نئی کتاب''، نئی دہلی

و

سابق جنرل منیجر و مدیر کتاب نما

مکتبہ جامعہ نئی دہلی



اپنی بات

اردو زبان کی لسانی حقیقت کے ذیل میں مختلف باتیں کہی گئی ہیں، مگر سچ یہ ہے کہ مسلمانوں کی آمدِ ہند نے ایک ''نئی زبان'' کو جنم دیا۔ اس کے لیے ہمیں تذکروں کا مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ پہلا شاعر کہا جاتا ہے کہ مسعود نامی ہوا۔ جس کا دیوان ''ہندوی'' تھا۔ یہ پنجابی یا برج زبان کا شاعر تھا۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ ۱۵۲۶ء کے آس پاس جب بابر نے ہندوستان کو فتح کیا، تو اس کے اثرات اُس کے ۱۰ سالہ حکومت میں درپیش آئے۔ یہاں تک کہ شیخ گدائی جو عہد ہمایوں کا درباری شاعر تھا، وہ بھی اس نئی اور نومولود زبان کی سمت متوجہ ہوا۔ اکبر کے دربار میں یا عہد میں برج زبان نے زیادہ پیر پھیلائے اور عبدالرحیم خانخانہ نے ہندی ادب میں چوٹی کا مقام پایا۔ عہدا کبری میں ہی برج اور فارسی نے مخلوط ہوکر اردو کے حق میں فضا ہموار کی اور عہد شاہجہاں میں تو فارسی آمیز کھڑی بولی عروج میں آ گئی۔ البتہ شمالی ہند میں مسلمانوں کی آمد کے بعد الفاظ، کہاوتیں اور ترکیبوں کے سبب جو نئی زبان بن رہی تھی اس نے نیا روپ لے کر مستقل بولی کا روپ دھارلیا۔ یہاں تک کے ۱۶۵۰ء کے بعد اس نئی زبان نے با قاعدہ شاعری کی شکل اختیار کرلی اور عہدِ شاہجہاں سے لے کر عہد اورنگ زیب کی تاریخ شاہد ہے کہ اوروں کے سوا چندر بھان برہمن کے کلام میں نئی زبان کے تراشے ملنے لگے۔ پھر اورنگ زیب، بہادر شاہ فرخ سیر کا دور ۱۷۰۰ء تک آیا، تو زبان نے ہم آہنگ ہوکر نئی طرح اختیار کرلی۔ مثال کے بطور

جب دل کے آستاں پر عشق آں کر پکارا
پردے سے یار بولا، بیدل کہاں ہیں ہم

ماہر السنہ اور صاحب نثر و زبان شاگرد غالب دہلوی، حضرت سید فرزند احمد صفیر بلگرامی کی تحقیق السنہ کے مطابق، مسلمانوں کی آمد سندھ و پنجاب میں فارسی وعربی زبان کی آمیزش نے مقامی بولی کو متاثر کرنا شروع کیا تو ایک نئی زبان کا جنم لینا واجبات میں سے تھا۔ پھر آریہ قوم جو بہت عرصہ قبل ایران کی راہ سے ہندوستان میں داخل ہو چکی تھی اس کی اپنی اور مقامی بولیوں کے استعمال نے جو مرکب زبان پیدا کی، اُس کے نتیجے میں یہ حادثہ تو رونما ہونا یقینی تھا۔ صفیر بلگرامی اپنے مشاہدے کے مطابق یہ بھی کہتے ہیں کہ...... عبرانی زبان ہو یا عہد موسیٰ وابراہیم علیہ السلام کی زبان، جب عربوں نے عربی زبان کو ثقافت بخشی تو پورے عرب کی زبان تمثیلی ہوکر عربی بن گئی۔ یمن۔ شام۔ مصر۔ قرب وجوار کے علاقے سب کے سب عربی اقتدار میں آتے ہی ایک زبان کے ہو گئے۔ ہندوستان میں بھی ایسا ہی ہوا۔ بہر حال زبان کی تاریخ ہمیں اپنے دور کی یاد دلانے کے لئے کافی ہے۔ مختصر یہ کہ شمالی ہند اور جنوبی ہند نے جو راستہ اختیار کیا یا بدلا اس سے اردو زبان نے بہت کچھ کھویا اور پایا بھی۔ مطلب یہ کہ ۱۳۵۰ء سے ۱۷۰۰ء تک کا زمانہ دکن میں زبان وبیان کا تاریخی دور کہلا سکتا ہے۔ (۱) بہمنی دور جو ۱۳۵۰ء سے ۱۵۵۰ء تک رہا۔ (۲) ۱۵۵۰ء سے ۱۷۰۰ء تک کا زمانہ دکن کی آزاد ریاستوں کے اقتدار کا رہا۔ حضرت گیسو درازؒ۔ میراں جی شمس العشاق۔ شاہ برہان الدین جانم وغیرہ نے جو کچھ کہا یا لکھا۔ (نثر یا نظم دونوں میں) اس سے اردو کا خمیر اٹھا۔ وہ اگر چہ تصوف کا نشاۃ ثانیہ تھا، مگر تھا تو اردو زبان سے ملحق۔ اسی طرح بیجاپور کے فرماں رواؤں نے ۱۴۹۰ء سے ۱۶۹۶ء تک خدمت زبان انجام دینے میں کسر نہیں چھوڑی۔ ابراہیم عادل شاہ (مشہور جگت گرو) کی نورس اور ملک الشعراء نصرتی کی تصنیف ''علی نامہ'' پھر گلدستۂ عشق کی چار ہزار ابیات کی مثنوی اور

مجموعہ غزلیات اس کے سوا ملتا ہے۔ اسی طرح کمال خاں متخلص رستمی (وفات ۱۶۴۹ء) نے مثنوی خاور نامہ کا فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا۔ نیز قطب شاہی دور میں ۱۶۱۱ء سے ۱۶۲۵ء تک کہ شعراء میں عبداللہ قطب شاہ (۱۶۷۵ء-۱۶۲۵ء) کے علاوہ ابوالحسن تاناشاہ کی خدمات شاعری بھی نام آور ہے۔ قطب شاہی دور کا گل سرسبد ملاوجہی (۱۶۳۵ء) کی سب رس اور قطب مشتری یادگار ہیں۔ غواصی (وفات ۱۶۱۲ء) کی طوطی نامہ اور ابن نشاطی (وفات ۱۶۵۵ء) کی پھول بن اس عہد کے نادر و یگانہ ادب پارے ہیں۔

جنوبی ہند کے اس منظرنامہ کے بعد مغل دور (۱۷۲۱ء) کے محمود بحری مثنوی ''من لگن'' اور امین کی ''یوسف زلیخا''، وجدی (وفات ۱۷۳۳ء) کی مثنوی ''باغ جانفزا'' کے سوا ولی دکنی (۱۷۶۰ء-۱۶۶۸ء) کی خدمات زبان اردو ایک ایسے ہی موڑ کا پیش خیمہ ہے جس کی یاد ہمیشہ تازہ رہے گی۔ مشہور ہے کہ ۱۶۲۲ء یا اس کے بعد ولی دکنی کا دیوان دہلی آیا تو شمالی ہند کی آب و ہوا نے شاعری کی نئی تبدیلی کی راہ اختیار کرنے پر عملاً غور کیا۔ یہی نہیں یہ عمل بھی لائق غور ہے کہ شمالی ہند مین عالم گیر اورنگ زیب کی وفات کے بعد نثری کتب کا سلسلہ شروع ہوتا نظر آتا ہے جس میں فضلی کی ''دہ مجلس'' یا ''کربل کتھا'' جو ۱۷۲۵ء کی یادگاری ادب پارہ ہے۔ اسی طرح رجب علی بیگ سرور (۱۸۲۹ء-۱۷۸۷ء) کی فسانہ عجائب وغیرہ کا درجہ مشہور ہے، لیکن شمالی ہند میں مغل حکومت کے خاتمہ سے مسلمانوں کی آبرومندانہ زندگی گذارنے سے محروم کرنے کا عمل جو شروع ہوا تھا، اس کے مدِ نظر ایسٹ انڈیا کمپنی نے بامقصد ادارہ ''فورٹ ولیم کالج'' قائم کیا تاکہ مسلمانوں کو تادیبی زندگی گذارنے پر مجبور کیا جائے اور ان کی زباں پر قدغن لگا کر بے بس کر دیا جائے، لیکن ہوا اس کے خلاف، یعنی ہندوستان آنے والے انگریزوں کو مقامی زبان سے واقفیت حاصل کرنا اشد ضروری خیال کیا گیا۔ لہذا فورٹ ولیم کالج نے ایک نئی تاریخ رقم کی۔ اور طے کیا کہ اردو میں ایسی سادہ اور آسان زبان کی تصانیف لکھی جائیں جو آسان زبان اور بامحاورہ ہوں۔ کالج کی یہ کوشش دو وجہوں سے مقبول انام ہوئیں۔ (اول) کالج کو ایسے افراد مل گئے جو ہندوستانی زبان و ادب پر عبور رکھتے تھے۔ (دوم) کالج کے لئے فراخ حوصلہ جان گلکرائسٹ جیسی شخصیت مل گئی جو مشرقی علوم سے دلچسپی رکھتا اور گرامر و لغت سازی کی جس نے طرح ڈالی۔ پھر نئی طرز کی تصانیف لکھنے پر آمادہ کیا۔ اس اہم علمی کام کے واسطے کالج میں چند معتبر مصنفین جمع کیے۔ ان میں میر امن دہلوی۔ حیدر بخش حیدری، شیر علی افسوس۔ کاظم علی جوان۔ مرزا علی لطف، نہال چند لاہوری اور لالہ جی وغیرہ کی خدمات کو قبول عام کا درجہ دیا گیا۔ مگر میر امن کو ان کی ٹکسالی زبان اور محاورہ دانی۔ قصہ گوئی کی طبع وغیرہ کے مدِ نظر ماہر السنہ میں شمار کر کے ان کی پذیرائی کی گئی۔ ڈاکٹر پنٹر۔ گلکرسٹ۔ ڈاکٹر فیلن۔ جان شکیسپیئر۔ گارساں دتاسی نے بھی دلچسپی لی اور اردو کے اس کاروان میں اردو کو نئی جہت سے آشنائی بخشی۔

اس تفصیل کے بعد عرض ہے کہ راقم نے ۱۹۵۸ء سے ایک سلسلہ اردو ادب کے ادیبوں کے حالات ان کے اپنے دستِ قلم سے لکھوانا شروع کیا۔ اب تک دو ڈھائی سو محسنین اردو کے حالات قلم کردہ ہیں۔ مشفق خواجہ۔ جمیل الدین عالی۔ رشید احمد صدیقی۔ ذاکر حسین خان (صدر ہندوستان) اور سید حامد و دیگر اہل علم کی تجاویز تھیں کہ محسنین اردو کا ایک ایسا تصویری البم بھی منظر عام پر لایا جائے جو نادر و یگانہ اور پُراز معلومات ہو۔ خدا کا شکر ہے کہ بھائی بشیر (آپ کے بھائی حنیف رامے پنجاب کے وزیر اعلیٰ بھی تھے) کی وساطت سے یہ تاریخی اہم خاکہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے تاکہ محسنین اردو سے نئی پود بھی عہد بہ عہد کی معلومات سے کسی حد تک واقف ہو سکے۔ ضرورت ہے ان حضرات کے سوانحی خاکہ شائع کیے جائیں۔

سید مرتضٰی حسین بلگرامی زید الواسطی
فاطمہ منزل، علی گڑھ

(۱۱)

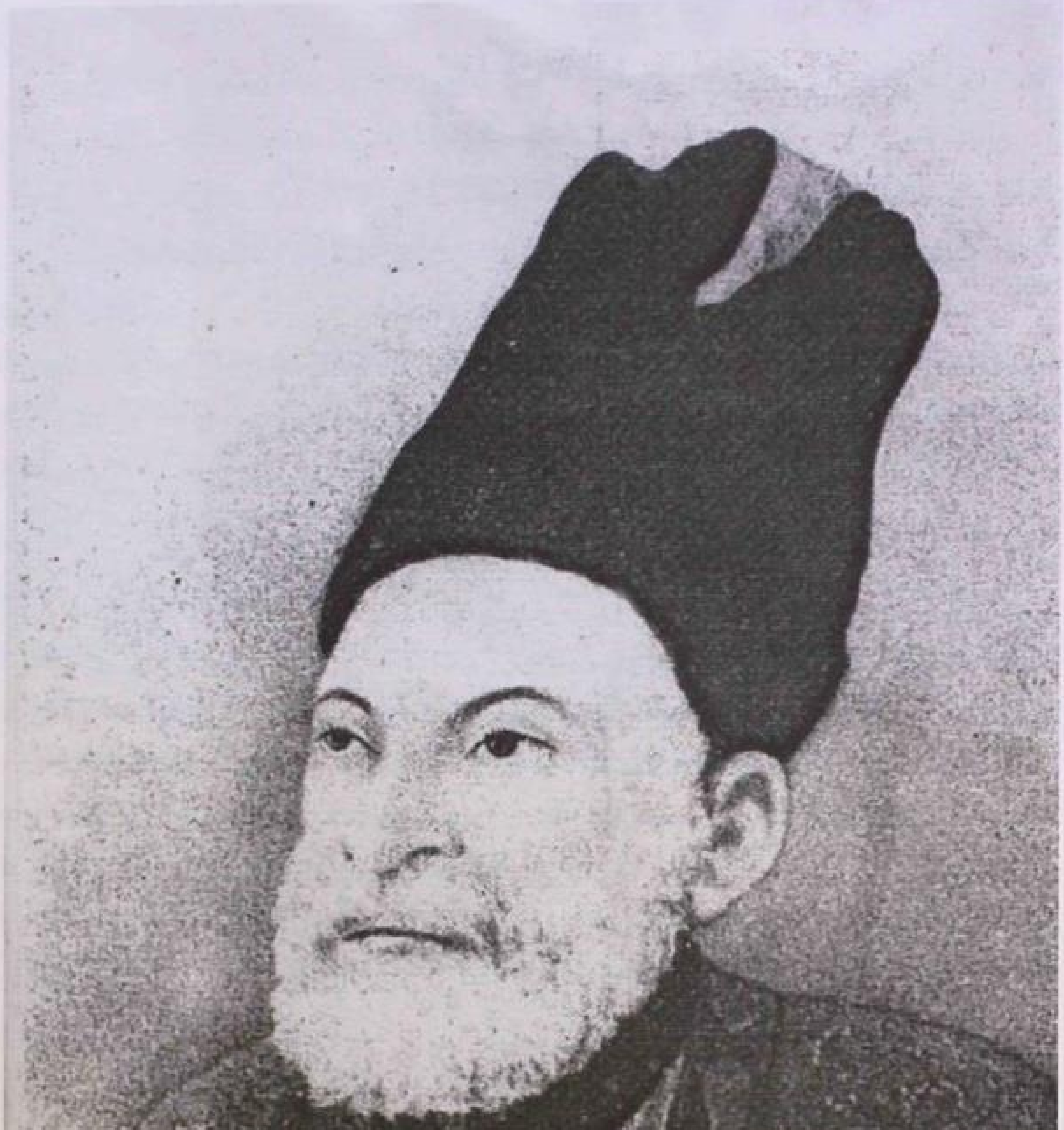
میر امّن دہلوی

(اُردو کے پہلے ادیب)

(۱۸۰۳۔۱۷۳۳ء)

آثار الصنادید (۱۸۴۵ء) میں سر سید رقمطراز ہیں "میر امّن کا نام اُردو نثر میں اُسی مقام کا مستحق ہے جو نظم میں میر تقی میر کو حاصل ہے۔"

میر امّن ۱۷۳۳ء۔ (۱۱۴۶ھ) میں بعہد محمد شاہ دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے بُزرگ سلطنت مغلیہ میں ہمایوں کے دور سے ہر بادشاہ کے عہد میں ممتاز عہدوں پر فائز رہے تھے۔ احمد شاہ ابدالی کے حملہ ۱۷۶۱ء سے سلطنت کی تباہی اور دلّی کی بربادی کے بعد میر امّن تلاشِ معاش میں کلکتہ چلے گئے اور وہیں بعمر ستر سال ۱۸۰۳ء۔ ۱۲۱۷ھ میں وفات پائی۔ ڈاکٹر گل کرائسٹ (جن کو اردو زبان سے عشق تھا اور جو فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے پرنسپل تھے) کی فرمائش پر میر امّن نے ۱۸۰۱ء میں قصہ "چہار درویش" (جو امیر خسرو دہلوی نے فارسی میں لکھا تھا) کا اردو میں ترجمہ کیا۔ خود لکھتے ہیں "میں نے اس محاورے سے لکھنا شروع کیا، جیسے کوئی باتیں کرتا ہے۔" میر امّن نے نثر کی طرف ایسی توجہ دی اور اس میں ایسی ایسی گلکاریاں کیں کہ لوگ نثر سے دل چسپی لینے لگے۔ "باغ و بہار" میں دلّی کی شُستہ اور دل کش زبان نے جان ڈال دی ہے۔ اردوئے معلّی کا روزمرّہ اور محاورہ، زبان کا لوچ اور بیان کی دل کشی، فقروں کی شگفتگی، مکالموں کی دل فریبی، برمحل اختصار اور منظر کشی، یہ سب خوبیاں اس زمانے کے کسی اور مصنف میں ایسے کمال کے ساتھ یکجا نہیں ہیں۔ "باغ و بہار" اس زمانے کے تمدّن اور معاشرت کا آئینہ ہے۔ جب تک اردو زندہ ہے، میر امّن کا نام زندہ رہے گا اور ان کی کتاب "باغ و بہار" کی بہار تازہ رہے گی۔ میر امّن زبان کی سند کا ذکر کرتے ہوئے "باغ و بہار" کے دیباچہ میں لکھتے ہیں۔ "جو شخص دلّی کا روڑا ہو کر رہا اور دس پانچ پشتیں اُسی شہر میں گزریں، اور اس نے دربار اُمراء کے دیکھے اور میلے ٹھیلے، عرس، چھڑیاں، سیر و تماشا اور کوچہ گردی، اس شہر کی، کی ہوگی، اور وہاں سے نکلنے کے بعد اپنی زبان کو لحاظ میں رکھا ہوگا، اس کا بولنا البتہ ٹھیک ہے۔" **قصہ بادشاہ آزاد بخت کا۔** "میرے قبلہ گاہ نے جب وفات پائی اور میں تخت پر بیٹھا، عینِ عالمِ شباب کا زمانہ تھا اور یہ سارا ملک "روم" کا میرے حکم میں تھا اتفاقاً ایک سال کوئی سوداگر "بدخشاں" کے ملک سے آیا، اور اسباب تجارت کا بہت سا لایا۔ خبرداروں نے میرے حضور میں عرض کی کہ ایسا بڑا تاجر آج تک اس شہر میں نہیں آیا۔ میں نے اس کو طلب فرمایا۔ وہ تحفے ہر ایک ملک کے، لائق میری نذر کے لے کر آیا۔ فی الواقع ہر ایک جنس بے بہا نظر آئی۔ چنانچہ ایک ڈبیا میں ایک لعل تھا نہایت خوش رنگ اور آب دار، قد و قامت میں درست اور وزن میں پانچ مثقال کا۔ میں نے باوجود سلطنت کے ایسا جواہر کبھی نہ دیکھا تھا"۔ "دائی پھر دائی اور مجھے اپنے ساتھ جس محل میں بادشاہزادی تھی، لے گئی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ دورویہ صف باندھے دست بستہ سہیلیاں، خواصیں اور قلماقلنیاں، ترکنیاں، حبشیاں، اُذبکنیاں، کشمیرنیاں جواہر میں جڑی، عہدے لئے کھڑی ہیں۔ اندر کا اکھاڑا کہوں یا پریوں کا اُتارا؟ بے اختیاری سے ایک آہِ بے خودی زبان تک آئی اور کلیجہ تھلکنے لگا۔ پاؤں سو سومن کے ہوگئے۔ ایک طرف چلون پڑی تھی اور مونڈھا جڑاؤ بچھا رکھا تھا اور ایک چوکی بھی صندل کی بچھی تھی، میں مونڈھے پر بیٹھ گیا"۔ "حاتم کو جب نوفل کے روبرو لے گئے۔ اس نے پوچھا کہ اسے کون پکڑ لایا؟ ایک بدذات سنگ دل بولا کہ ایسا کام سوائے ہمارے اور کون کر سکتا ہے، یہ فتح ہمارے نام ہے، ہم نے عرش پر جھنڈا گاڑا ہے۔ ایک اور لن ترانی والا ڈھینگ مارنے لگا کہ میں کئی دن سے دوڑ دھوپ کر کے جنگل سے پکڑ لایا ہوں، میری محنت پر نظر کیجئے اور جو قرار ہے سو دیجئے۔ جب اپنی اپنی دلاوری اور مردانگی سب کہہ چکے تب حاتم نے بادشاہ سے کہا اگر سچ بات پوچھو تو یہ ہے کہ وہ بوڑھا جو الگ سب سے کھڑا ہے مجھ کو لایا ہے۔ میرے پکڑنے کی خاطر جو قول کیا ہے۔ پورا کرو"۔ **مفلسی۔** "کوئی بات کا پوچھنے والا نہ رہا جو کہے کہ تمہارا کیا حال ہے سوائے غم اور افسوس کے کوئی نہ ٹھہرا۔ اب دمڑی کی ٹھڈیاں میسر نہیں جو چبا کر پانی پیوں۔ دو تین فاقے جو کڑا کے کئے تاب بھوک کی نہ لا سکا" (باغ و بہار ۱۸۰۱ء)



غالب

مرزا غالبؔ

(۱۷۹۷۔۱۸۶۹ء)

اسداللہ خاں نام، غالبؔ تخلص ۱۷۹۷ھ میں آگرہ میں پیدا ہوئے۔ دلّی میں شادی ہوئی۔ اسی کو اپنا وطن بنالیا اور وہیں ۱۸۶۹ء میں وفات پائی۔ اردو شاعری میں خیالات کی بلندی، تخیل کی جدّت اور طرز ادا کی ندرت غالبؔ کے کلام کی خوبیاں ہیں، لیکن اردو نثر کی تاریخ میں بھی ان کا مقام بہت بلند ہے۔ ان کے رقعات اپنی جدّت دلفریبی اور طرز ادا کے لحاظ سے خاص درجہ رکھتے ہیں۔ مرزا پہلے فارسی میں خطوط لکھا کرتے تھے، پھر اردو میں خود لکھتے ہیں۔ ''زبان فارسی میں خطوں کا لکھنا پہلے سے متروک ہے'' پیری، اسیری اور ضعف کے صدموں سے محنت پژدہی اور جگر کاوی کی قوت مجھ میں نہیں رہی۔ حرارت عزیزی کو زوال ہے اور یہ حال ہے۔

مضمحل ہوگئے قویٰ غالبؔ! اب عناصر میں اعتدال کہاں

مرزا غالبؔ اپنی زندگی ہی میں نظم سے زیادہ نثر نگاری میں شہرت حاصل کر چکے تھے، ان کے خطوط سے خاص وعام سب یکساں لطف اٹھاتے تھے۔ نثر اردو میں غالبؔ کی اولیّت ان کے رقعات کے سبب ہے۔ غالبؔ نے اردو خطوط نویسی کی جو طرز ایجاد کی اور اس میں جو جدّتیں پیدا کیں، اس میں غالب اول سے آخر تک غالب رہے۔ مولانا حالیؔ ''یادگار غالب'' (۱۸۹۶ء) میں لکھتے ہیں۔ ''مرزا غالبؔ کی اردو خط وکتابت کا طریقہ فی الواقع سب سے نرالا ہے۔ مرزا سے پہلے کسی نے خط وکتابت میں یہ رنگ اختیار کیا اور نہ ان کے بعد کسی سے اس کی پوری پوری تقلید ہوسکی۔ ادائے مطلب کا طریقہ بالکل ایسا ہے، جیسے دو آدمی آپس میں بات چیت یا سوال جواب کرتے ہوں۔ مرزا غالب کی جس چیز نے ان کے مکاتیب کو ناول اور ڈرامے سے زیادہ دلچسپ بنادیا ہے وہ ان کی شوخ تحریر ہے۔ مرزا کی طبیعت میں شوخی ایسی بھری ہوئی تھی جیسے ستار کے تار میں سُر بھرے ہوئے ہوتے ہیں اور قوتِ متخیلہ جو شاعری اور ظرافت کی خلّاق ہے اس کو مرزا کے دماغ کے ساتھ وہی نسبت تھی جو قوتِ پرواز کو طائر کے ساتھ۔ بلحاظ دلچسپی اور لطفِ بیان کے، مرزا کے خطوط اپنی نظیر آپ ہیں۔'' مولانا سید سلیمان ندوی ''نقوشِ سلیمانی'' میں لکھتے ہیں۔ ''مرزا غالبؔ کیا کیا خونِ جگر کھا کر اپنے فارسی نامے لکھا کرتے تھے، مگر تقدیر کی عجائب کاری دیکھئے کہ ان کے اس خونِ جگر کا ایک قطرہ بھی ہمارے ادبی خزانہ کا کوئی قیمتی لعل نہ بن سکا اور ان کی اردو کے چند فقرے جو ہنستے بولتے، چہکتے چہچہاتے ان کی زبانِ قلم سے نکل گئے، ان کا ہر لفظ قدر دانوں میں موتیوں سے زیادہ قیمتی ٹھہرا اور آج وہ ہمارے ادبی خزانہ کا بیش قیمت سرمایہ ہے۔'' خطوط غالبؔ۔ ''مرزا صاحب میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ [۱] بنادیا ہے۔ ہزار کوس سے بزبان قلم باتیں کیا کرو، ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو، کیا تم نے مجھ سے بات کرنے کی قسم کھائی ہے؟ اتنا تو کہو کہ یہ کیا بات تمہارے جی میں آئی ہے؟ برسوں ہوگئے کہ تمہارا خط نہیں آیا۔'' ''بھائی مہدی، کیا پوچھتے ہو، کیا لکھوں، دلّی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر تھی۔ قلعہ، چاندنی چوک، ہر روز مجمع جامع مسجد کا، ہر ہفتہ سیر جمنا کے پُل کی، ہر سال میلہ ''پھول والوں'' کا۔ یہ پانچوں باتیں اب نہیں، پھر کہو دلّی کہاں؟ ہاں کوئی شہر قلمرو ہند میں اس نام کا تھا''۔ شفیق کے نام ''پیرومُرشد، بارہ بجے تھے، میں ننگا پلنگ پر لیٹا ہوا حقّہ پی رہا تھا کہ ایک آدمی نے آکر خط دیا، میں نے کھولا، پڑھا، بھلے کو انگرکھا یا کُرتا گلے میں نہ تھا۔ اگر ہوتا تو میں ---- ڈالتا۔ حضرت کا کیا جاتا، میرا نقصان ہوتا'' ''کیوں صاحب روٹھے ہی رہو گے یا کبھی منو گے بھی اور اگر کسی طرح نہیں منتے تو روٹھنے کی وجہ تو لکھو۔ میں اس تنہائی میں صرف خطوں کے بھروسے جیتا ہوں یعنی جس کا خط آیا میں نے جانا کہ وہ شخص تشریف لایا۔ ایک دو صبح کو، اور ایک دو شام کو ڈاک کا ہرکارہ خط لاتا ہے۔ میری دل لگی ہوجاتی ہے۔ ان کے پڑھنے اور جواب لکھنے میں وقت گزر جاتا ہے۔ خط لکھو صاحب! نہ لکھنے کی وجہ لکھو، آدھ آنے میں بخل نہ کرو، ایسا ہی ہے تو بیرنگ بھیجو۔''

---

[۱] محمد بیگ ادھر سے نکلا، بھئی محمد علی بیگ، لوہارو کی سواریاں روانہ ہوگئیں؟ حضرت ابھی نہیں، کیا آج نہ جائیں گی؟ آج ضرور جائیں گی تیاری ہورہی ہے۔'' غالبؔ



رجب علی بیگ سرورؔ

(۱۷۸۷-۱۸۶۹ء)

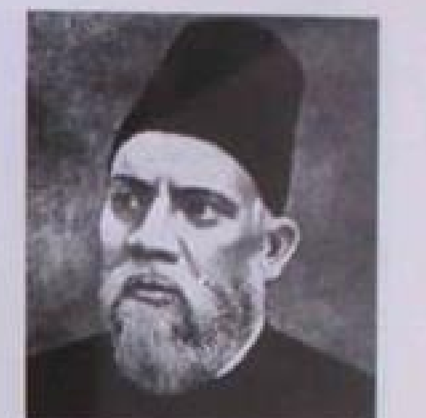
سرور ۱۷۸۷ء میں بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے۔ والد کا نام اصغر علی بیگ تھا۔ ۱۸۲۴ء میں غازی الدین حیدر، شاہِ اودھ نے جلاوطن کر دیا تو سرورؔ کانپور چلے گئے۔ لیکن نصیر الدین حیدر نے پھر لکھنؤ بلا لیا۔ بعد میں واجد علی شاہ نے سرور کو اپنا درباری شاعر مقرر کیا۔ جب ۱۸۵۶ء میں سلطنتِ اودھ ضبط ہوئی اور واجد علی شاہ جلاوطن ہو کر مٹیا برج کلکتہ میں نظر بند کیے گئے تو سرور کو مہاراجہ بنارس نے اپنے پاس بُلا لیا اور وہیں ۱۸۶۹ء میں "فسانۂ عجائب" لکھی۔ یہ ان کا بڑا کارنامہ ہے اور اسی سے اُن کا نام زندہ ہے۔ "فسانۂ عجائب" کی عبارت نہایت پُرتکلف، مقفع و مسجع ہے۔ ہر جگہ رنگینی اور دلکشی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور یہ سرور کا بہت بڑا کمال تھا کہ وہ ایک معمولی قصہ کو اپنی انشا پردازی سے بے حد دلکش اور رنگین بنا دیتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ اس رنگ کے لکھنے والوں میں سرور کا پایہ سب سے بلند ہے۔ ان کے زمانے میں یہ رنگ بہت محبوب و مقبول تھا اور علم انشا کا کمال گنا جاتا تھا۔ اسی لئے "فسانۂ عجائب" پسندیدہ نظروں سے دیکھی جاتی تھی۔ جاڑا "ناگاہ ایک روز موکب (کیمپ) حشمت وجلال بافر، شان وشوکت کمال ایک صحرائے باغ و بہار، دشتِ لالہ زار، میں ہوا، فضائے صحرا قابل تحریر کیفیت دشت گلشن آسا لائق تقریر، بوباس ہر برگ وگل کی۔ رشک مُشک اذفر، صفحہ بیابان معنبر و معطّر، چشموں کا پانی مصفا آب گوہر سے آب دار تر، ذائقے میں بہ از شیر وشکر، چلّے کے جاڑے، کڑاکے کی سردی تھی، گویا زمین سے آسمان تک یخ بھری تھی، آواز کسی کی کسی کے کان تک کم جاتی تھی، مُنہ سے بات باہر آئی اور جم جاتی تھی، مار سیاہ اوس چاٹنے باہر نہ آتا تھا۔ شمع انجمن لگن تک گرتے گرتے اولا تھا، شعلہ کانپتا تھا۔ آتشِ رخسار گل شبنم نے بجھائی تھی۔ باغ میں بھی جاڑے کی دُہائی تھی۔ مُرصّع کاری یک لخت نظر آتی تھی۔ دانہ ہائے اشکِ شبنم خواہ، بڑے یاریزے تھے، ہر شجر کے پتے اور شاخ میں الماس اور موتیوں کے آویزے تھے۔ یہاں تک کہ جاڑے کا زور شور عالم گیر ہوا تھا کہ کرۂ ناز، زمہریر، زمزمہ ریز، خوش بیان، گلشن تقریر میں یوں چہکتا ہے کہ ایک دن "ماہ طلعت" نے غسل کیا اور لباس مکلّف سے جسم کو آراستہ، زیور پُرتکلف سے پیراستہ ہو، جواہر نگار کرسی پر بیٹھی۔ ہوا جو لگی آئینہ میں صورت دیکھ خود محوِ تماشا ہوئی۔ خواصوں نے حُسنِ خداداد کی، داد، دی۔ ماہِ طلعت طوطے سے مخاطب ہوئی۔ "تو نے ایسی صورت کبھی دیکھی ہے؟" طوطے نے کہا۔ "شاید، تمھیں سچی ہو۔" یہ سن کر شہزادی مشتعل ہوئی۔ جب شہزادہ آیا تو ماہِ طلعت نے کہا۔ "اگر میری بات کا طوطا جواب صاف نہ دے گا تو اس نگوڑے کی گردن مروڑ اپنے تلووں سے اس کی آنکھیں ملوں گی۔ جب دانا پانی کھاؤں پیوں گی۔" جانِ عالم نے کہا "تم تو پَری ہو۔ جانور کی بات پر اتنا آزردہ ہو۔ گو، گویا ہے پھر طائر ہے"۔ "مدفن کسی نے بعد دفن سنگِ مرمر کا مقبرہ بنایا۔ کسی نے مَرمَر کے گور گڑھا پایا۔ کسی کا مزار منقش رنگارنگ ہے۔ کسی کا مانند سینۂ جاہل، گور تنگ ہے۔ حسرت دُنیا سے کفن چاک ہوا۔ بستر دونوں کا فرش خاک ہوا۔ جب گردشِ چرخ نے گُنبد گرایا تو ایک نے نہ بتایا کہ دونوں میں یہ گورِ شاہ ہے، یہ لحد فقیر ہے۔ اس کو مرگِ جوانی نصیب ہے تو یہ استخوانِ بوسیدہ پیر ہے" (فسانۂ عجائب) (۱۸۲۴ء)


سر سید

سرسیّد

(۱۸۱۷-۱۸۹۸ء)

سیّد احمد خاں نام، دہلی وطن، ۱۸۱۷ء میں پیدا ہوئے اور ۱۸۹۸ء میں علی گڑھ میں وفات پائی۔ والد کا نام میر تقی تھا۔ سرسیّد کو عزم اور استقلال کا جوہر اپنی والدہ سے ورثہ میں ملا اور یہی ان کی کامیابی کا راز ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں ناکامی کے بعد جب مسلمانوں پر مردنی چھاگئی تھی اور قوم کا شیرازہ بکھر گیا تھا، اس وقت سرسیّد نے مایوس اور افسردہ قوم میں نئی روح پھونکی اور ایسا قومی جذبہ پیدا کیا جواب تک قائم ہے۔ سرسیّد نے مسلمانوں کے لئے ''تعلیم'' کو ترقی کا زینہ قرار دے کر ۱۸۷۵ء میں علی گڑھ میں ''مدرسۃ العلوم'' قائم کی اور یہ علم وادب کا مرکز بنا۔ وہ قوم کے سچے خادم، ملک کے خیر خواہ اور اپنی دھن کے پکّے رہنما تھے۔ اسی لئے مسلمان قوم پر سرسیّد کا بہت بڑا احسان ہے۔ سرسیّد اردو کے بھی بڑے محسن ہیں، انہوں نے اردو میں سب سے پہلے ''مضمون نگاری'' کی ابتدا کی اور انشاپردازی کو نیا اسلوب بخشا۔ آج جو خیالات بڑی آب وتاب اور عالمانہ سنجیدگی کے ساتھ مختلف انداز میں پیش کئے جاتے ہیں، وہ سرسیّد ہی کی بدولت ہیں۔ سرسیّد اعلیٰ علمی وادبی ذوق کے مالک تھے۔ ان کا بیان ہے۔ ''جیسا تصنیف وتالیف میں میرا جی لگتا ہے، ویسا کسی کام میں نہیں لگتا۔'' اسی لئے سرسیّد کی تحریر نے انشاپردازی میں انقلاب پیدا کردیا۔ خود لکھتے ہیں۔'' جہاں تک ہم سے ہوسکا ہم نے اردو زبان کی خدمت کی علم وادب کی ترقی میں ان پرچوں (تہذیب الاخلاق) کے ذریعہ سے کوشش کی۔ مضمون کے ادا کرنے کا ایک سیدھا اور صاف طریقہ اختیار کیا۔ رنگین عبارت سے جو تشبیہات اور استعارات خیالی سے بھری ہوتی ہیں اور جس کی شوکت صرف لفظوں ہی لفظوں میں رہتی ہے اور دل پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا، پرہیز کیا ہے۔ تک بندی سے جو اس زمانہ میں مقفّٰی عبارت کہلاتی تھی ہاتھ اُٹھایا۔ جہاں تک ہوسکا سادگی عبارت پر توجہ کی اور اس میں کوشش کی۔ جو کچھ لطف ہو وہ صرف مضمون کے ادا میں ہو، جو اپنے دل میں ہو وہی دوسرے کے دل میں پڑے، تاکہ دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے۔'' مضمون نگاری کا ''سہرا'' سرسیّد کے سر ہے جنھوں نے قومی وملکی، مذہبی ومعاشرتی، اصلاحی واخلاقی، علمی وادبی تحریروں میں بے ساختگی، طرزِ بیان، طرزادا کی روانی واسلوب کی سادگی وصفائی، استدلال کے زور، حسب موقع متانت وظرافت اور زبان ومحاورہ کی لطافت کے ذریعے ثابت کردیا کہ اردو زبان میں ہر قسم کے مضامین ادا کرنے کی قوت وصلاحیت ہے۔ امید کی خوشی۔ ''او، نورانی چہرہ والے یقین کی اکلوتی خوبصورت بیٹی ''امید'' یہ خدائی روشنی تیرے ہی ساتھ ہے۔ تو ہی ہماری مصیبتوں کے وقتوں میں، ہم کو تسلی دیتی ہے۔ تو ہی ہمارے آڑے وقتوں میں ہماری مدد کرتی ہے۔ اے ہمیشہ زندہ رہنے والی امید، جبکہ زندگی کا چراغ ٹمٹماتا ہے اور دنیاوی حیات کا آفتاب لبِ بام ہوتا ہے، منہ پر مُردنی چھاتی ہے تو تیرا ہی نورانی چہرہ دکھائی دیتا ہے۔ تیری صدا کان میں آتی ہے اور نئی روح اور تازہ خوشی حاصل ہوتی ہے اور ایک نئی لازوال زندگی کی جس میں ایک ہمیشہ رہنے والی خوشی ہوگی ''امید'' ہوتی ہے اور دوسری دنیا جس میں ہم کو ہمیشہ رہنا ہے تین چیزوں سے طے ہوتی ہے، ایمان کے توشہ، اور امید کے ہادی اور موت کی سواری سے، مگر ان سب میں جس کو سب سے زیادہ قوت ہے، وہ ایمان کی خوبصورت بیٹی ہے، جس کا پیارا نام ''امید'' ہے۔'' ''تعلیم'' میں سمجھتا ہوں کہ انسان کی روح بغیر تعلیم کے چتکبرے سنگ مرمر کے پہاڑ کی مانند ہے کہ جب تک سنگ تراش اس میں ہاتھ نہیں لگاتا اور اس کا دھندلا اور کھردراپن دور نہیں کرتا، اس کو خراش تراش کر سڈول نہیں بناتا، اس کو پالش اور جلا سے آراستہ نہیں کرتا اس وقت تک اس کے جوہر اسی میں چھپے رہتے ہیں اور اس کی خوش نمانسیں اور دلربا رنگتیں اور خوب صورت خوبصورت، بیل بوٹے ظاہر نہیں ہوتے۔ یہی حال انسان کی روح کا ہے۔ انسان کا دل کیسا ہی نیک ہو، مگر جب تک اس پر عمدہ تعلیم کا اثر نہیں ہوتا اس وقت تک ہر ایک نیکی اور ہر ایک قسم کے کمال کی خوبیاں جو اس میں چھپی ہوئی ہیں اور جو بغیر اس قسم کی مدد کے نمودار نہیں ہوسکتیں، ظاہر نہیں ہوتیں۔'' (مضامین سرسیّد)



(۱۷)

نذیر احمد

(۱۸۳۶-۱۹۱۲ء)

آپ ۱۸۳۶ء میں بجنور میں پیدا ہوئے۔ ''دہلی کالج'' میں تعلیم پائی اور دہلی ہی کو اپنا وطن بنالیا اور وہیں ۱۹۱۲ء میں وفات پائی۔ انہوں نے اردو ناول کو مہذب اور سنجیدہ رنگ میں پیش کیا۔ ان کا پایہ اردو نثر میں بہت بلند ہے اور ان کا شمار آج بھی چوٹی کے نثر نگاروں میں ہوتا ہے۔ مولوی نذیر احمد اردو کے پہلے ناول نگار ہیں۔ ان کے تمام ناول اصلاحی و معاشرتی ہیں۔ ''مراۃ العروس'' ان کا پہلا ناول ہے اس میں اصغری کے کردار کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ''اصغری اس گھر میں ایسی تھی جیسے باغ میں پھول یا آدمی کے جسم میں آنکھ۔ ہر ایک طرح کا ہنر، ہر ایک طرح کا سلیقہ اس کو حاصل تھا۔'' نذیر احمد نے دہلی کے شریف گھرانوں کی گھریلو زندگی کے بڑے کامیاب نقشے کھینچے ہیں اور خاص دہلی کی ٹکسالی زبان اور محاورے استعمال کیے ہیں۔ وہ عورتوں کے مکالمے کے بادشاہ ہیں۔ نذیر احمد کی بے نظیر قدرت بیان، وسیع ذخیرۂ الفاظ اور جدّت خیال اردو لٹریچر کی جان ہیں۔ ترجمہ قرآن مجید۔ مولوی نذیر احمد کا عظیم الشان کارنامہ قرآن کریم کا ترجمہ ہے (ان سے پہلے شاہ رفیع الدینؒ اور شاہ عبدالقادر دہلویؒ کے اردو ترجمے موجود تھے جن کی زبان سو سال پرانی ہو چکی تھی، یہ ترجمہ بے تکلف زبان و محاورہ میں کیا ہے۔ مثلاً ''پھر عرش پر جا براجا''، ''(اس پر شیطان بولا کہ جیسی تو نے میری راہ ماری ہے، میں بھی تیرے سیدھے راستے پر بنی آدم کی تاک میں بیٹھوں تو سہی''، ''ان کے باپ (یعقوبؑ) نے کہنا شروع کیا کہ اگر مجھ کو سترا بہترا نہ بناؤ تو ایک ابات کہوں کہ) مجھ کو تو یوسف کی مہک آرہی ہے''، ''تو (اے پیغمبرؐ) تمہارے پروردگار نے ان (سب) پر عذاب کا کوڑا پھٹکارا۔ بے شک تمہارا پروردگار نافرمانوں کی تاک میں (لگا رہتا) ہے''، ''تو ان کے پروردگار نے ان کے گناہ کے بدلے ان پر ہلاکت لا نازل کی اور سب کو (مار کے) ٹپڑا کر دیا''، (شمس پارہ ۳۰)، ''کیونکہ نماز صبح کا وقت نور ظہور کا وقت ہے'' (بنی اسرائیل پارہ ۱۵)۔ ساس بھی مزاج دار'' (بہو) کی باتوں سے تنگ آکر ترکی بہ ترکی جواب دیتی ہے۔ ''مجھ کو کیا معلوم تھا کہ یکا یک تم کو اس کی یاد گدگدائے گی۔ بٹی نوج کسی کو کسی سے ایسا عشق ہو جیسا تم کو ''بنّو'' کا ہے۔ مجھ کو تو اپنا بڈھا چونڈا نہیں منڈوانا جو لڑکے کی بے اجازت ڈولی منگوادوں''، ''اکبری نے روٹی پکائی تو عجیب صورت کی۔ نہ گول نہ چوکھنٹی۔ ایک کان ادھر نکلا ہوا اور چار کان اُدھر۔ کنارے موٹے، بیچ میں ٹکیا، کہیں جلی کہیں کچی، دھوئیں میں کالی۔ اور دال جو پکائی تو پانی الگ، دال الگ، غرض ''مزاج دار'' ایسا لذیذ کھانا پکاتی تھی کہ جس کو دیکھ کر بھوک بھاگ جائے۔ سالن پکاتی تو بد رنگ، بد مزہ، نمک ڈالا تو زہر اور کبھی پھیکا پانی۔'' ماما عظمت (مہاجن سے کہتی ہے)، ''الگ گھر کرنا کیسا ''چھوٹی بہو'' تو بڑے گل کھلائیں گی۔ ''بڑی بہو'' بد مزاج تھیں لیکن دل کی صاف اور یہ زبان کی میٹھی اور دل کی کھوٹی، کوئی کیسا ہی جان مار کر کام کرے، ان کی خاطر تلے نہیں آتا۔ بات بھی کہیں گی تو تنہ کی۔ منہ پر کچھ، دل میں کچھ، نہ بابا: یہ عورت ایک دن نباہ کرنے والی نہیں۔ اب تو پہاڑ پر باپ پاس جانے کی تیاریاں کر رہی ہیں۔''، ''اے لالہ، یہ کیا تم نے مجھ سے آئے دن کی چھیڑ خانی مقرر کی ہے۔ جب مجھ کو دیکھتے ہو تقاضا کرتے ہو۔ جن کو دیتے ہو ان سے مانگو۔ ان پر تقاضا کرو۔ میں بیچاری غریب آدمی۔ ٹکے کی اوقات مجھ سے اور مہاجنوں کے لین دین سے کیا واسطہ؟ میری ایسی کیا حیثیت تم نے دیکھ لی۔ میرے پاس نہ جائداد نہ دولت اور تم نے سینکڑوں روپیہ آنکھ بند کر کے مجھ کو دے دیا اور اگر مجھ کو دیا تو جاؤ مجھ ہی سے لے بھی لینا۔ میرے جو مخمل کھڑے ہوں گے بکوالینا۔ قلعہ میں جو میری تنخواہ ہوگی بند کرا دینا''، ''باپ کی نصیحت۔ اصغری، بیاہ کے بعد نئی دنیا شروع ہوتی ہے نئے لوگوں سے معاملہ کرنا اور نئے گھر میں رہنا پڑتا ہے۔ نکاح ہوا لڑکی ''بی بی'' بنی۔ لڑکا ''میاں'' بنا۔ اس کے معنی ہیں کہ دونوں کو پکڑ کر دنیا کی گاڑی میں جوت دیا۔ اب یہ گاڑی آخری منزل تک ان کو کھینچنی پڑے گی۔ بس بہتر یہ ہے کہ دل کو مضبوط کر کے اس بار عظیم کا تحمل کیا جائے اور زندگی کے دن جس قدر ہوں عزت، آبرو، صلح کاری و اتفاق سے کاٹ دیے جائیں۔ ورنہ لڑائی بھڑائی، جھگڑے بکھیڑے، شور و فساد اور واویلا سے دنیا کی مصیبت اور بھی تکلیف دہ ہوتی ہے (مراۃ العروس) (۱۸۶۹ء)



محمد حسین آزاد

(۱۸۲۸-۱۹۱۰ء)

مولانا آزاد ۱۸۲۸ء میں دہلی میں پیدا ہوئے اور وہیں دہلی کالج میں تعلیم پائی۔ محکمہ تعلیم کی ملازمت کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی و فارسی کے پروفیسر ہو گئے۔ ۱۹۱۰ء میں انتقال ہوا۔ اردو نثر نگاروں میں آزاد کی شخصیت بہت نمایاں ہے۔ نثر میں ان کا طرز جداگانہ ہے۔ ان کی تصانیف میں "آب حیات" اور "نیرنگ خیال" نے اہل قلم کو محوِ حیرت کر دیا۔ محمد حسین آزاد میں نازک خیالی اور لطافت و موزونیت خداداد تھی۔ فارسی زبان کی محبت نے اس جوہر کو اور بھی چمکا دیا۔ نثر میں شاعرانہ تخیل اور اسلوب بیان کی دلکش و برجستہ مثالیں آزاد کے علاوہ اور کہیں نہیں ملتیں۔ مثلاً "غرض رات نے صبح کی کروٹ لی، ستارہ نے آنکھ ماری اور شفق خونی پیالہ بھر کر مشرق سے نمودار ہوئی۔" جس انشاپردازی کو ادب کی جان اور لٹریچر کی روح کہا جا سکتا ہے وہ صرف آزاد کی تحریر ہے۔ ان کا انداز بیان، دلکش اور دل آویز ہوتا ہے۔ اس انشاپردازی کی تقلید آج کسی سے نہیں ہو سکی۔ آزاد کے الفاظ کی شیرینی اور نمکینی، سب مل کر، سادگی و پرکاری کا عجیب نادر نمونہ پیش کرتے ہیں۔ آزاد اسی اسلوب بیان کے سبب سے صاحب طرز کہلاتے ہیں۔ ان کے ادب پارے "غیر فانی" ہیں۔ **اردو کا عالم طفولیت**۔ "ادھر تو یہ چونچال لڑکا شعرا کے جلسوں میں اور امراء کے درباروں میں اپنے بچپنے کی شوخیوں سے سب کے دل بہلا رہا تھا، اُدھر دانائے فرنگ، جو کلکتہ میں فورٹ ولیم کے قلعہ پر دوربین لگائے بیٹھا تھا، اس نے دیکھا، نظر باز تاڑ گیا کہ لڑکا ہونہار ہے مگر تربیت چاہتا ہے۔ تجویز ہوئی کہ جس ملک پر حکمرانی کرتے ہیں اس کی زبان سیکھنی واجب ہے۔" "تم دیکھنا، وہ بلندی کے مضمون نہ لائیں گے۔ آسمان سے تارے اتاریں گے۔ قدردانوں سے فقط داد نہ لیں گے، پرستش لیں گے۔ لیکن نہ وہ پرستش کہ سامری کی طرح عارضی ہو۔ ان کے کمال کا دامن قیامت کے دن سے بندھا پاؤ گے۔ یہ اپنی صنعت میں کچھ کچھ تکلف بھی کریں گے۔ مگر ایسا جیسے گلاب کے پھول پر شبنم یا تصویر پر آئینہ، ان کا تکلف بھی اصلی لطافت پر کچھ زیادہ کرے گا۔ اس کی خوبی پر پردہ نہ ہوگا۔ تم میر صاحب (میر تقی میر) اور خواجہ میر درد کو دیکھو گے کہ اثر میں ڈوبے ہوں گے۔ سودا کا کلام باوجود بلندی مضمون اور چستی بندش کے تاثیر کا طلسم ہوگا" (آب حیات)۔ "حضرت عشق نے شادی کی تھی اور محبت کے قاضی نے نکاح پڑھایا تھا۔ ہمایوں کو دم بھر کی جدائی گوارا نہ تھی، دن ایسے نحوست کے تھے کہ ایک جگہ قرار نہ تھا۔ جودھپور کا رخ ہے کہ ادھر سے امید کی آواز آئی ہے۔ قریب پہنچ کر معلوم ہوتا ہے کہ وہ امید نہ تھی دغا آواز بدل کر بولی تھی، وہاں تو موت منہ کھولے بیٹھی ہے۔" "اس عالم میں ایک ملازم نے آ کر خبر دی کہ "مبارک" اقبال کا تارا طلوع ہوا (اکبر بادشاہ پیدا ہوا) یہ ستارہ ایسے ادبار کے وقت جھلملایا تھا کہ کسی کی آنکھ ادھر نہ اٹھی، مگر تقدیر ضرور کہتی ہوگی کہ دیکھنا، آفتاب ہو کر چمکے گا اور سارے ستارے اس کی روشنی میں دھندلے ہو کر نظروں سے غائب ہو جائیں گے" (دربار اکبری) **بقائے دوام کا دربار**۔ "اس کے بعد ایک اور بادشاہ آیا۔ وہ مخمور نشہ میں چور تھا۔ ایک عورت صاحب جمال اس کا ہاتھ پکڑے آتی تھی اور جدھر چاہتی تھی پھراتی تھی وہ جو کچھ دیکھتا تھا اسی کے نور جمال سے دیکھتا تھا اور جو کچھ کہتا تھا اسی کی زبان سے کہتا تھا۔ اس پر بھی ہاتھ میں ایک جزو کاغذوں کا تھا اور کان پر قلم دھرا تھا۔ یہ سانگ دیکھ کر سب مسکرائے۔ مگر چونکہ دولت اس کے ساتھ تھی اور اقبال آگے آگے اہتمام کرتا آتا تھا اس لئے بدمست بھی نہ ہوتا تھا۔ جب نشہ سے آنکھیں کھلتی تھیں تو کچھ لکھ بھی لیتا تھا۔ وہ "جہانگیر" تھا اور بیگم "نور جہاں" تھی۔" (نیرنگ خیال) (۱۸۹۰ء) **تختِ طاؤس**۔ "بارہ مرصع ستونوں پر مغرق محرابیں اور جڑاؤ مینا کاری کی چھت دھری تھی۔ چھت سے پائے تک خالص کندن اور آبدار جواہرات سے جگمگ جگمگ کر رہا تھا اور تین سیڑھی بلند چبوترے پر یہ عالم تھا گویا ایک ستارے کا نگینہ ہے کہ انگوٹھی پر دھرا ہے۔ اس کی روکار کی محراب پر ایک درخت طلائی بھاری دھرا تھا جسے سبزہ والماس سے سرسبز اور لعل و یاقوت سے گلرنگ کیا گیا تھا۔ اِدھر اُدھر اس کے دو مور رنگا رنگ کے جواہرات سے مرصع چونچ میں موتیوں کی تسبیحیں لئے اس طرح کھڑے تھے گویا اب ناچتے ہیں۔ چاروں طرف چتر زرنگار جن میں موتیوں کی جھالر جھلملاتی تھی آگے ایک شامیانہ جواہرات اور موتیوں کی آبداری سے دریائے نور کی طرح لہراتا تھا۔"



سید فرزند احمد صفیر بلگرامی ابن سید احمد بلگرامی

پیدائش: مارہرہ (یوپی) ۱۸۳۲ء وفات: آرہ (بہار) ۱۸۹۰ء

سید فرزند احمد صفیر بلگرامی ابن سید احمد عبدالحی عرف سید احمد بلگرامی متخلص احمدؔ یا عاصیؔ ۲۷ ذی قعدہ ۱۲۴۹ھ مطابق ۷/ اپریل ۱۸۳۴ء کو مارہرہ شریف ضلع ایٹہ، بستی شاہ سید صاحب عالم متخلص صاحب کے یہاں پیدا ہوئے تھے۔ عمر کی دوسری برس آپ مارہرہ سے بلگرام محلّہ میدان پورہ میں اپنے بزرگوں کے ساتھ تشریف لے آئے، پھر آباؤ اجداد کے ساتھ آرہ (بہار) آ گئے۔ اس ذیل میں صفیر کا مشہور شعر ہے۔

مولد و مسکن وطن ہے اے صفیر
تین جا مارہرہ، آرہ بلگرام

آرہ مارہرہ اور بلگرام کی علمی و دانشوری فضا نے صفیر کو بچپن سے ہی زبان و ادب سے دلچسپی پیدا کر دی تھی۔ چنانچہ اپنی ابتدائی عمر سے ہی شعر و شاعری کی سمت متوجہ ہو گئے۔ پہلے قطب تخلص اختیار کیا تھا۔ ایک مقطع ملاحظہ ہو

رہ جائیں گے بوسے کے لیے لیک اے قطب
سوگند، قسم ہے کبھی کھایا نہ کریں گے

لیکن قطب کے سوا آثم، اثیم، صبا، نالاں، احقر کے بعد آخر صفیر کا دائمی تخلص اختیار کیا۔ آپ کے اساتذہ میں سید محمد مہدی خبرؔ بلگرامی، حضرت امام علی سحر لکھنوی کے سوا مرزا دبیر اور غالب دہلوی وغیرہ کے نام بھی شامل ہیں۔

صفیر بلگرامی کو اللہ نے سید اولاد احمد اور سید خورشید احمد جیسے دو بھائی عطا کیے تھے، ان کے سوا وجاہت فاطمہ اور تصدق فاطمہ دو بہنیں بھی تھی۔ اولاد تو لاولد گزر گئے، خورشید احمد کے بیٹے محمود احمد سے جمیل احمد ہوئے۔ جنھوں نے غیر کفو میں رشتہ کیا اور خاندانِ بلگرام کی شاخ سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے لیکن صفیر بلگرامی کے بیٹے سید نور احمد بلگرامی متخلص گرامی کی اولادوں نے بڑا نام کمایا اور صاحب عزّ و جاہ کے سوا، اُردو ادب کے نام آور افراد میں شمار ہوئے۔ سید عنایت احمد بلگرامی دلگیر تخلص کمشنر اور سید وصی احمد بلگرامی فانی تخلص کلکٹر صاحب طرز انشا پرداز پاک و ہند میں شمار کیے گئے۔

صفیر بلگرامی پر ڈاکٹر ظفر اوگانوی کا مقالہ ''صفیر بلگرامی'' سال ۱۹۷۶ء میں منظر عام پر آیا۔ اس مقالہ کے ممتحن پروفیسر سید احتشام حسین صاحب ماہلی اور پروفیسر سید نجیب اشرف صاحب ندوی تھے۔ اس مقالہ میں بعض خامیاں راہ پا گئی ہیں مگر حق یہ ہے کہ صفیر بلگرامی پر جس محققانہ انداز میں کام کیا گیا ہے وہ لائق تعریف ہے۔ صفیر بلگرامی کی تصانیف کی جو تعداد بعض محققین نے تحریر کی ہیں، ان کی برخلاف ظفر اوگانوی نے بذاتِ خود مطالعہ کر کے تحقیق کے مطابق، ان کی مکمل فہرست منضبط کر دی ہے۔ جسے اب آخری فہرست کتب صفیر ہی تسلیم کرنا مناسب امر ہوگا جو درج ذیل ہیں۔ البتہ کمی بیشی ہر دور میں ممکنات کی بات ہے۔ فہرست تصانیف صفیر بلگرامی:

محشرستان خیال، ضمیمہ محشرستان خیال، جوہر مقالات، رشحات صفیر، تذکرہ جلوۂ خضر، خلاصہ فیض صفیر، نمیقہ محبت وثیقہ، ضمیمہ اظہار الاسرار، تاریخ بلگرام، انشاء سبد گل، تصدق الایمان، مرغوب القلوب، پرستانِ خیال (ترجمہ بوستانِ خیال)،

صفیر بلبل، مراثی صفیر، دیوان قلمی، دیوان خمسہ جات، خمخانہ صفیر، صبح اُمید، حسیّن بند، نادِعلی، قصیدہ بلاعنوان، نظر النظار، زمزمہ صفیر، عبرت الناظرین ہفت گوہر، فتنۂ عشق، دعوتِ احباب، میلادِ معصومین، کل تیس کتب ہیں۔ لیکن اس کے سوا صفیر بلگرامی کی دستی کشکول بھی راقم کے پاس ہے، جو بذاتِ خود ایک تصنیف کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کشکول میں خطوط کی نقل، مضامین کی نقول، جلوۂ خضر سے متعلق یادداشتیں اور تاریخ بلگرام سے متعلق چند اہم مواد وغیرہ تحریر ہیں جسے دل پسند اور بے مثال کہا جا سکتا ہے۔

صفیر بلگرامی شاعر ہی نہیں، شاعر گر بھی تھے جن کی خاصی تعداد تھی۔ مرقع فیض میں ساٹھ سے زائد شاگردوں کے نام ہیں۔ جس کی طباعت ۱۲۹۵ھ میں ہوئی تھی۔ یعنی وفاتِ صفیر بلگرامی سے بارہ سال قبل۔ اس عرصہ میں مزید اضافہ ہی ہوا ہوگا۔

صفیر بلگرامی کو مرزا غالب نے لکھا تھا:

سنین عمر کے ستر ہوئے شمار برس
بہت جیوں تو جیوں اور تین چار برس

اس شعر کے جواب میں شاگرد نے استاد کو دعائیہ جواب بھی شعر ہی میں دیا تھا۔

سنا صفیر یہ کہتے ہیں حضرتِ غالب
بہت جیوں تو جیوں اور تین چار برس
مگر یہ پہلے سے اعداد غین کی ہے دُعا
خدا کرے مرا غالب جئے ہزار برس

آخر کلام کے طور پر صفیر بلگرامی کی شاعری کے چند نمونہ ملاحظہ ہوں:

کیا پوچھنا تمہاری سخن دانی کا صفیر
ترکیب بامذاق ہے، انداز با مزا
اُڑتی پھرے گی خاک مری کوئے یار میں
مجنوں ہی تھا جو تھک کے بیاباں مین رہ گیا
منھ جو ملانے چاند سے بیٹھے آئینہ لے کر کوٹھے پر
تارے پکارے تم نے صاحب حسن کو طشت ازبام کیا
عذر کرتے ہو لو قصور ہوا
کہہ دو منھ سے کہ رنج دور ہوا
نہ کوئی حال پہ اپنے رویا
روئے ہم سارے زمانے کے لیے
قصہ ہمارا تم سے سنا بھی نہ جائے گا
تم کیا سنوگے، ہم سے کہا بھی نہ جائے گا
مل جائے اگر کہیں جوانی تو کہوں
اللہ رِی بے درد یہ دُھوکا دینا
کل جو اُٹھتے تھے بٹھانے کے لیے
آج بیٹھے ہیں، اُٹھانے کے لیے

سید فرزند احمد صفیر بلگرامی نے ۲۱ر رمضان المبارک ۱۳۰۷ھ میں ۵۷ر سال ۹ ماہ اور ۲۱ر یوم کی عمر پا کر پٹنہ میں قضا کیا۔ میت آرہ کے میر گنج کے قبرستان میں دفن کی گئی۔ تاریخ وفات: شہر رمضان المبارک کے اعداد میں پوشیدہ ہے۔



الطاف حسین حالی

(۱۸۳۷-۱۹۱۴ء)

الطاف حسین نام، حالی تخلص، ۱۸۳۷ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۱۴ء میں وفات پائی۔ تعلیم کے لئے دہلی پہنچے۔ شاعری میں مرزا غالب کے شاگرد تھے۔ پہلے گورنمنٹ بک ڈپو لاہور میں ملازم ہوئے۔ پھر عربک کالج دہلی میں مدرسی کی۔ اسی زمانے میں سرسید سے ملاقات ہوئی اور سرسیّد کے دستِ راست بن کر قومی تحریک کے ایک ممتاز رکن ہو گئے۔ سرسیّد کی فرمائش پر ۱۸۷۹ء میں اپنا مشہور "مسدّس" لکھا۔ جس نے مسلمانوں کو خواب غفلت سے چونکا دیا۔ نثر میں حیات سعدی، تریاق السموم، مجالس النساء، اخلاق قصہ اور "حیاتِ جاوید" (سرسیّد کی سوانح عمری) اور "یادگار غالب" میں مرزا غالب کے کمالات کو اجاگر کیا۔ حالی نے "مقدمہ شعر و شاعری" میں فن شعر پر جو بھرپور تنقید کی ہے اردو کے تمام تنقیدی لٹریچر میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ اسی نے لوگوں میں علمی تحقیق اور شاعری کی تنقید کا مذاق پیدا کیا۔ مولانا حالی ایک ہی وقت میں بلند مرتبہ شاعر بھی ہیں اور اعلیٰ نثر نگار بھی۔ ان کے فن سوانح نگاری میں نکتہ رسی اور سخن آفرینی کا ایک خاص سلیقہ ہے۔ لٹریچر کا بہت بڑا وصف یہ ہے کہ سخت سے سخت مسائل باتوں باتوں میں طے کر دئے جائیں۔ یہ سلاست و نفاست قدرت کلام کی آخری حد ہے جو سرسیّد کے بعد حالی کے حصّہ میں آئی۔ حالی میں قوتِ بیان، فصاحت اور روانی بدرجۂ اتم موجود تھی۔ زبانِ گویا۔ "اے میری بلبل ہزار داستان، اے میری طوطیٔ شیریں بیان، اے میری قاصد، اے میری ترجمان، اے میری وکیل، اے میری زبان سچ بتا کہ تو کس درخت کی ٹہنی اور کس چمن کا پودا ہے کہ تیرے ہر پھول کا رنگ جدا اور تیرے ہر پھل میں ایک نیا مزا ہے۔ کبھی تو ایک ساحر فسوں ساز ہے جس کے سحر کا رد، نہ جادو کا اتار۔ کبھی تو ایک افعی جاں گداز ہے جس کے زہر کی دارو، نہ کاٹے کا منتر، تو وہی زبان ہے کہ بچپن میں کبھی اپنے ادھورے بولوں سے غیروں کا جی لبھاتی تھی اور کبھی اپنی شوخیوں سے ماں باپ کا دل دکھاتی تھی۔ تو وہی زبان ہے کہ جوانی میں کہیں اپنی نرمی سے دلوں کو شکار کرتی تھی اور کہیں اپنی تیزی سے سینوں کو فگار کرتی تھی" (مضامین حالی) (۱۸۹۸ء)۔ "سرسیّد میں قوت استدلال بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ انہوں نے تیس بتیس برس کے عرصہ میں اردو لٹریچر کا رخ پھیر دیا اور مسلمانوں کے پولیٹکل، سوشل اور مذہبی خیالات میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔ ان کے ہاں تشبیہات واستعارات، صنائع لفظی و معنوی، شاعرانہ ترکیبیں، فاضلانہ و منشیانہ تراش خراش نظر نہیں آتی۔ البتہ عبارت کی سادگی اور بے ساختگی سرسیّد کی تحریر کی عام خاصیت ہے۔ سرسیّد کے کام میں جو تاثیر تھی وہ درحقیقت ان کی سچائی اور حق گوئی کا نتیجہ تھا" (حیات جاوید)۔ "نیچرل شاعری سے وہ شاعری مراد ہے جو لفظاً و معناً دونوں حیثیتوں سے نیچرل یعنی فطرت و عادت کے موافق ہو۔ تم میرے پاس ہوتے ہو گویا + جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا (مومن) یہ نیچرل شعر سمجھا جائے گا۔ کیونکہ جس سے تعلق بڑھ جاتا ہے اس کا تصور تنہائی میں ہمیشہ پیش نظر رہتا ہے یا مثلاً رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج + مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں غالب کا یہ شعر بھی نیچرل ہے اور فطرت انسان کی کس قدر گہری اور پوشیدہ خاصیت کا پتا دیتا ہے۔ جس کے بیان کرنے کے بعد کوئی شخص اس سے انکار نہیں کر سکتا۔ اوپر کے اشعار جیسا کہ ظاہر ہے ایسے ہیں جن کو لفظاً اور معناً دونوں حیثیتوں سے نیچرل کہنا چاہئے۔" (مقدمہ شعر و شاعری) (۱۸۹۳ء)۔ حالی نے ۱۹۱۴ء میں رحلت کی۔



علامہ شبلی نعمانی

(۱۸۵۷-۱۹۱۴ء)

مولانا شبلیؒ ۱۸۵۷ء میں ضلع اعظم گڈھ میں پیدا ہوئے۔ علمیت وفضیلت کے اعلی مدارج طے کئے۔ ۱۸۸۱ء میں سرسیّد نے انہیں علی گڑھ کالج میں فارسی کا پروفیسر بنا دیا۔ علی گڑھ کی فضا شبلی کی علمی نشو ونما کے لئے بہت مفید ثابت ہوئی اور وہیں سے علمی دنیا میں شہرت حاصل کی۔ مولانا شبلی نے علم کلام، تاریخ، تنقید، سیرت، غرض ہر میدان میں اپنی ذہانت کا نقش جمایا۔ لیکن سب سے زیادہ نام، تاریخ اور تنقید میں پیدا کیا۔ ادب، تاریخ اور تحقیق میں مولانا کا رتبہ بہت بلند ہے۔ آخر عمر میں ''سیرت النبی'' شروع کی۔ دو جلدیں مکمل کی تھیں کہ زندگی نے وفا نہ کی اور ۱۹۱۴ء میں وفات پائی۔ شبلی کی طرز تحریر اپنی شگفتگی، بانکپن، روانی اور زور زبان، کے اعتبار سے بہت ممتاز ہے۔ ''ظہور قدسی۔ آج کی صبح وہی صبح جاں نواز، وہی ساعت ہمایوں، وہی دور فرخ فال ہے۔ ارباب سیر اپنے محدود پیرایۂ زبان میں لکھتے ہیں کہ ''آج کی رات ایوان کسریٰ کے چودہ کنگرے گر گئے۔ آتشکدۂ فارس بجھ گیا۔ دریائے سادہ خشک ہو گیا۔ لیکن سچ یہ ہے کہ ایوان کسریٰ نہیں بلکہ شان عجم، شوکتِ روم، اوج چین کے قصرہائے فلک بوس گر پڑے۔ آتش فارس نہیں بلکہ جحیم شر، آتشکدہ کفر، آذر کدۂ گمرہی، سرد ہو کر رہ گئے۔ صنم خانوں میں خاک اڑنے لگی۔ بت کدے خاک میں مل گئے۔ شیرازہ مجوسیت بکھر گیا۔ نصرانیت کے اوراق خزاں دیدہ، ایک ایک کر کے جھڑ گئے۔ توحید کا غلغلہ اٹھا۔ چمنستانِ سعادت میں بہار آ گئی۔ آفتاب ہدایت کی شعاعیں ہر طرف پھیل گئیں۔ اخلاق انسانی کا آئینہ پرتو قدس سے چمک اٹھا۔ یعنی یتیم عبداللہ، جگر گوشۂ آمنہ، شاہِ حرم، حکمران عرب، حرمان دودھ عالم، شہنشاہ کونین کی ولادت ہوئی اور نام محمدؐ رکھا گیا۔'' ''دعوت عشیرہ۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جب خدا کا حکم آیا'' اور اپنے نزدیک کے خاندان والوں کو خدا سے ڈرا'' تو آپؐ نے حضرت علیؑ سے کہا کہ'' دعوت کا سامان کرو۔'' سب جمع ہو گئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کھانے کے بعد کھڑے ہو کر فرمایا ''میں وہ چیز لے کر آیا ہوں جو دین اور دنیا دونوں کو کفیل ہے۔ اس بار گراں کو اٹھانے میں کون میرا ساتھ دے گا۔'' تمام مجلس میں سناٹا چھا گیا۔ دفعۃً حضرت علیؑ نے اٹھ کر کہا۔ ''میں آپ کا ساتھ دوں گا۔'' قریش کے لئے یہ ایک حیرت انگیز منظر تھا کہ دو شخص (جن میں ایک سیزدہ ۱۳ سالہ نوجوان ہے) دنیا کی قسمت کا فیصلہ کر رہے ہیں۔ حاضرین کو بیساختہ ہنسی آ گئی۔ لیکن آگے چل کر زمانے نے بتا دیا کہ یہ سراپا سچ تھا'' (سیرۃ النبی جلد اول) اسلامی حکومت کا تمدن پر اثر۔ ''زنانہ لباس، زیور اور آرائش کے متعلق نور جہاں بیگم نے جو اختراعات کئے۔ تہذیب وتمدن قیامت تک اس احسان سے سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ نور جہاں سے پہلے زیورات بھدّے اور ناموزوں ہوتے تھے۔ نور جہاں ایک تاریخی چیز ہے۔ عطر بھی نور جہاں کی ایجاد ہے۔ لباس اور وضع قطع میں بھی نازک ادائیاں نہ تھیں دلی اور لکھنؤ کی بیگمات۔ اور وضع کی تمام تراش خراش، سب نور جہاں کے عہد کی یادگاریں ہیں، جن میں خفیف تغیرات ہوتے گئے۔ خود جہانگیر کہا کرتا تھا کہ جب تک نور جہاں میرے گھر میں نہیں آئی، میں گھر کی زیب وزینت سے واقف نہ ہوا'' (مقالات شبلی)۔ **شاعری کس چیز کا نام ہے۔** ''کسی چیز کا، کسی واقعہ کا، کسی حالت کا، کسی کیفیت کا، اس طرح بیان کیا جانا کہ اس کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جائے دریا کی روانی، جنگل کی ویرانی، باغ کی شادابی، سبزے کی لہک، پھولوں کی مہک، خوشبو کی لپٹ، نسیم کے جھونکے، دھوپ کی سختی، گرمی کی تپش، جاڑوں کی ٹھنڈ صبح کی شگفتگی، شام کی دلآویزی، یا رنج وغم، غیظ وغضب، جوش ومحبت، افسوس وحسرت، عیش وطرب، استعجاب وحیرت، ان چیزوں کا اس طرح بیان کرنا کہ وہی کیفیت دلوں پر چھا جائے، اس کا نام شاعری ہے۔ اس کے ساتھ الفاظ میں فصاحت، سلاست، روانی، بندش میں چستی اور چستی کے ساتھ بے تکلفی، دلآویزی اور برجستگی، لطیف اور نازک تشبیہات اور استعارات اصول بلاغت کے مراعات پائے جاتے ہوں'' (موازنہ انیس ودبیر ۱۹۰۶ء)



ڈاکٹر سیّد علی بلگرامی

(۱۸۵۱ء۔۱۹۱۱ء)

شمس العلما ڈاکٹر سید علی بلگرامی ابن سید زین الدین حسین بلگرامی ۱۸۵۱ء میں پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ فارسی، عربی کی تعلیم کے بعد ۱۸۷۴ء میں بی اے (اختیاری زبان سنسکرت کے ساتھ صوبہ بہار میں اوّل آئے) پاس کرنیکے بعد ۱۸۷۹ء میں تعلیم حاصل کرنے انگلستان گئے، اور یورپ سے ڈاکٹریٹ اور ڈی لٹ کی ڈگریاں لیں۔ آکسفورڈ یونیورسٹی میں آپ سنسکرت کے پروفیسر بھی مقرر ہوئے۔ بلگرامی اٹھارہ زبانوں کے ماہر تھے۔ لیکن تصنیف کی طرف کبھی توجہ نہیں کی۔ صرف ترجمے ان کی یادگار ہیں۔ مگر وہ ترجمے بھی تصنیف سے کم نہیں۔ "تمدّنِ عرب" کا ترجمہ اس قدر لطیف ہے کہ یہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ یہ ترجمہ ہے۔ نازک سے نازک فلسفیانہ بحثیں اور معمولی روز مرّہ اس برجستگی کے ساتھ اُردو قالب میں ڈھالے گئے ہیں کہ ان ترجموں سے معلوم ہوتا ہے کہ سیّد علی بلگرامی کو اُردو زبان پر پوری طرح عُبور حاصل تھا۔ "تمدّنِ عرب" اور "تمدّنِ ہند" کے ترجموں نے ان کی شہرت کو چار چاند لگادیے اور انہی ترجموں کی وجہ سے اِن کا نام زندہ ہے۔ سیّد علی بلگرامی نے "تمدّنِ عرب" کے ذریعے ہماری گزشتہ عظمت کا مرقع پیش کیا ہے۔ اِس سے پہلے ہم نے اپنی صُورت یوں نہ دیکھی تھی۔ ان دونوں کتابوں کا مصنف ڈاکٹر لی بان فرانسیسی محقق ہے۔ ہوش بلگرامی لکھتے ہیں۔ "۳۱ مئی ۱۹۱۱ء کو آسمان سے ملک الموت بن کر ایک تارا ٹوٹا جس کی روشنی سے سب کی آنکھیں چکاچوند ہوگئیں۔ مگر اُن کے پلک جھپکاتے ہی ان کی (سیّد علی بلگرامی) کی حرکتِ قلب بند ہوگئی۔" ہارون رشید۔ "۷۸۶ء تا ۸۰۹ء میں ہارون رشید کا نام کل رُبعِ مسکون میں مشہور ہوگیا۔ چین و تاتار و ہندوستان کے سفیر اس کے پاس آئے تھے اور "شارل مین" شہنشاہِ فرانس نے بھی جو حقیقت میں تمام یورپ کا مالک تھا اور جس کا ملک بحرِ اٹلانٹک سے دریائے ایلپ تک وسیع تھا۔ لیکن فی الواقع جس کی حکومت وحشیوں کی سی حکومت تھی، ہارون رشید[۱] کے پاس سفیر بھیجے اور نہایت ادب سے خواہش کی کہ زائرینِ بیت المقدس کی حفاظت کا بندوبست کیا جائے۔ خلیفہ نے اس درخواست کو قبول کیا اور سفیروں کو بیش بہا تحائف دے کر رخصت کیا۔ منجملہ ان تحائف کے ایک ہاتھی تھا جس کی جھول بہت ہی بیش قیمت تھی اور یہ جانور اس سے پہلے کبھی یورپ میں نہیں آیا تھا۔ علاوہ اس کے موتی، جواہرات، ہاتھی دانت، لوبان اور ریشمی انواع و اقسام کے کپڑے تھے اور ان سے پر مافوق ایک گھڑی تھی۔ جو وقت بتاتی تھی اور گھنٹوں پر بجتی تھی۔ اس گھڑی نے "شارل مین" اور اُس کے نیم وحشی مصاحبین کو جن کے ذریعے سے وہ بیچارہ بے فائدہ تمدّنِ روم کی تجدید کی کوشش کر رہا تھا نہایت چکر میں ڈالا۔ اِس کے دربار میں کوئی شخص بھی اس لائق نہ تھا جو اس گھڑی کے کیل کانٹے کو سمجھ سکتا۔" (تمدن عرب ۱۸۹۸ء) عرب اور چینی سیاح۔ "سلطنتِ روما کے زمانۂ انحطاط میں ہندوستان سے تعلقات اور بھی کم ہوگئے تھے اور بالآخر جس وقت عربوں نے خلفائے راشدین کے زمانے میں سلطنتِ نیرنطیہ کو فتح کرلیا تو اُن تعلقات کا خاتمہ ہوگیا۔ مُسلمانوں نے ایک ہزار سال تک اقوامِ نصاریٰ (عیسائیوں) کا راستہ ہندوستان کی طرف بند رکھا۔ اس زمانے کے حالات ہمیں صرف عرب سیاحوں کے بیانات سے معلوم ہوتے ہیں۔ مسعودی دسویں صدی عیسوی میں ہندوستان آیا اور ابن بطوطہ ۱۳۳۰ء میں لیکن ان عرب سیاحوں سے بہت پہلے بدھ مذہب کے چینی "زوّار" زیارت کرنے والے" اِس ملک میں آچکے تھے اور "ہوئن تسانگ" کا سفرنامہ ہمارے لئے بڑا ذخیرہ اُس زمانے کی معلومات کا ہے۔" (تمدن ہند ۱۹۱۲ء) شمس العلماء سید علی بلگرامی کی مطبوعات اٹھارہ سے زائد ہیں۔ آپ نے آخری عمر میں حیدر آباد کے بجائے مستقل رہائش بلگرام کی اختیار کرلی تھی۔ آپ نے ہی پہلا مسلم یونیورسٹی کا نستی ٹیوشن تیار کیا تھا۔ ملی اور علمی خدمات کے درمیان ہی مئی ۱۹۱۱ء میں انتقال کیا اور حسینہ شاہی بلگرام آپ کا مدفن قرار پایا۔

---

[۱] عبدالرزاق کانپوری "البرامکہ" میں لکھتے ہیں۔ "وزرائے برمکی کی بدولت عباسی حکومت اس عروج پر پہنچی۔ ہارون رشید کہا کرتا تھا۔ "افسوس! میں نے جعفر برمکی (وزیر) کو قتل کردیا اور خاندان برمکی کو تباہ کردیا"۔ جعفر کے قتل کے بعد ہارون رشید دن رات پریشان اور غمناک رہتا تھا اور کسی وقت اطمینان نصیب نہیں ہوا۔ ملک میں بغاوتیں ہونے لگیں۔" (مرتب)



عنایت اللہ دہلوی

(۱۸۶۹ـ۱۹۴۳ء)

آپ کی پیدائش ۱۸۶۹ء دہلی میں ہوئی، شمس العلما مولوی ذکاء اللہ دہلوی کے لائق فرزند تھے۔ الہ آباد اور علی گڑھ میں تعلیم پائی۔ اپنے والد سر سیّد اور علی گڑھ کالج کے پروفیسروں کی صحبت میں رہ کر ترجمہ کا شوق ہوا اور سر سیّد کی فرمائش پر سر ٹامس آرنلڈ کی ''پریچنگ آف اسلام'' کا ترجمہ ''دعوتِ اسلام'' کے نام سے کیا۔ اِن کا علمی کارنامہ لین پول کی مشہور کتاب ''صلاح الدین ایوبی'' اور ہیرلڈ لیمب کی دلچسپ اور محققانہ تصنیف ''چنگیز خاں'' اور ''تیمور'' کے ترجمے ہیں۔ اِن کا ایک اور شاہکار ''اُندلس کا تاریخی جغرافیہ'' ہے جو ڈوزی کی مشہور عالم کتاب کا ترجمہ ہے۔ سر ہنری ہسر ورتھ کی ''تاریخ مغل'' کی چار جلدوں کا ترجمہ بھی اُردو میں بڑی خوبی سے کیا ہے۔ اور کتابوں کے علاوہ شیکسپئر کے ڈراموں اور چند دوسرے ناولوں کا ترجمہ بھی کیا۔ حیدر آباد دکن میں ''دار الترجمہ'' کے ناظم تھے۔ ان کے تراجم اس قدر سلیس، آسان، عام فہم اور بافہم اور بامحاورہ ہوتے تھے کہ پڑھنے میں ذرا بھی اُلجھن نہیں ہوتی۔ انگریزی کتابوں کے تراجم میں انکی نظیر نہیں ملتی۔ اُردو کی تاریخ میں عنایت اللہ دہلوی کا نام مُترجم کی حیثیت سے باقی رہے گا۔ ۱۹۴۳ء میں دہلی میں وفات پائی۔ تائیس، میں ایک دُور دراز مقام کا رہنے والا راہب ہوں۔ تیرے حُسن کی شہرت مجھ کو یہاں تک لائی ہے۔ تجھ سے ملاقات کا شوق جنوں بن کر میرے سر پر سوار ہوا اور اب معلوم ہوا کہ جو کچھ سُنا وہ کم تھا اور جو دیکھا وہ زیادہ ہے۔ تُو اپنی شہرت سے ہزار چند زیادہ ہوشمند و حسین ہے۔ تائیس مجھ کو تجھ سے الفت ہے۔ تیری خاطر میں نے اپنے پیارے صحرا کو چھوڑا۔ میری رُوح تیرے لیے بیقرار ہے۔ دل کے بند ٹوٹ کر خیالات اُن سے پھوٹ نکلے ہیں اور بہتے چشمے بن گئے ہیں جن سے قمریاں پانی پیتی ہیں۔ تیرے لئے یہ برہنہ پاؤں زندہ سانپوں اور بچھوؤں پر، پڑ پڑ گئے ہیں۔ مجھ کو تجھ سے عشق ہیں۔ میرا عشق، عشق مجازی نہیں۔ عشقِ حقیقی ہے۔ میری الفت تیرے لئے حقیقتِ ازلی اور روحِ سرمدی کی بنا پر ہے۔ میرا عشق تیرے ساتھ خدائے ذوالجلال کے واسطہ اور تعلق سے ہے جو ہمیشہ رہے گا اور ہمیشہ میرے دل میں تیرا عشق ایک خیر محض اور جذبہ حقیقی ہے۔ میں جس چیز کا تجھ سے وعدہ کرتا ہوں وہ پھولوں کی مہک میں شراب کی مستی نہیں ہے اور نہ وہ ایک چھوٹی سی رات کا خواب گریز پا ہے میرا وعدہ تجھ سے ضیافتِ عشقِ حقیقی ہے۔'' تائیس۔ اے اجنبی میری تعریف میں اتنی عُجلت نہ فرمائیے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میری برق افگن نگاہیں آپ کے خرمنِ ہستی کو جلا کر خاک کر دیں۔ ختم کیجئے، آپ کی طولانی تقریر سے میرا حُسن مَیلا ہوتا ہے۔'' پفنوتوس۔ ''تائیس میں جانتا ہوں کہ تُو گناہوں کی زندگی گزار رہی ہے۔ لیکن جب تک میرا اور تیرا خیال ایک نہ ہو جائے گا میں تجھ سے جُدا نہ ہوں گا۔ کدھر ہے وہ ہاتفِ غیب جو میرے نُطق کو ایسا شرر بار کر دے کہ اس کی تاثیر سے تو موم کی طرح نرم ہو جائے۔ کدھر ہے وہ دستِ خیر جو تجھے میرے حوالے کر دے، تاکہ میں اپنے شوق اور آرزو کے مطابق تجھے حیاتِ ثانی بخشوں اور ایک نیا حُسن تجھ میں ایسا پیدا کر دوں کہ تو خوشی کے آنسو رو کر کہہ اٹھے کہ ''ہاں آج میں نے زندگی پائی ہے'' یہ سُن کر تائیس جو زنگار مسہری کی پٹی پر پاؤں لٹکائے۔ بیٹھی تھی، شرمائی۔ اپنا لباس بڑے انداز سے درست کیا۔ آنکھیں نیچی کیں جس سے اس کی خوبصورت آنکھوں کی بڑی بڑی پلکوں کا سایہ رُخساروں پر پڑتا تھا، برہنہ پاؤں زمین سے اُونچے تھے، چہرے پر شرم تھی اور صُورت سے معلوم ہوتا تھا، جیسے کوئی بھولا بچہ دریا کے کنارے بیٹھا ہو۔'' (تائیس ۱۹۳۶ء) عنایت اللہ دہلوی نے ۷۴ برس کی عمر میں ۱۹۴۳ء میں دہرہ دون میں قضا کیا۔ (مرتب)



مہدی افادی

(۱۸۷۵-۱۹۲۱ء)

مہدی حسن نام، گورکھ پور وطن، ۱۸۷۵ء میں پیدا ہوئے۔ علی گڑھ میں تعلیم پائی اور ۱۹۲۱ء میں انتقال ہوا۔ مہدی حسن مشہور انشاپرداز ہیں اور اسی انشاپردازی نے ان کو زندہ رکھا ہے۔ اردو لٹریچر کا نہایت لطیف اور صحیح مذاق رکھتے تھے۔ ان کی نثر میں انشاپردازی کی چاشنی اور زبان و بیان کا بانکپن ہے۔ یہ بھی نثر میں شاعری کرتے تھے۔ ان کی نثر میں وہ خصوصیات ملتی ہیں جو زندہ ادب میں ہونی چاہئیں۔ انہوں نے چند مضامین لکھے ہیں لیکن اپنی نثر کی رنگینی اور لطافت کی وجہ سے اردو زبان کے انشاپردازوں میں ممتاز حیثیت حاصل کرلی ہے۔ ان کے مضامین میں جدید تنقید نگاری کے بہترین نمونے، ادبی منصوبے، ادبی تجاویز، ادبی اشارے اور مختلف ادبی شخصیتوں کے متعلق جامع خیالات ملتے ہیں۔ مہدی کا فن ''آزاد'' اور ''شبلی'' کی خصوصیات کا انوکھا امتزاج ہے۔ ''ادب کی مثال اس مضراب کی سی ہے جو ان کے تاروں کو چھیڑتا ہے اور جس کا نغمۂ انسان کی خوابیدہ روح کو بیک وقت بیدار بھی کرتا ہے اور مست بھی۔'' ''اردو لٹریچر کے عناصر خمسہ سرسیّد، پروفیسر آزاد، نذیر احمد، حالی و شبلی ہیں جن کے قلم کے سایہ میں اردو یعنی کل کی چھوکری اتنی رودار ہوگئی کہ السنۂ یورپ یعنی مغربی بہنوں سے بے تکلف آنکھیں ملاسکتی ہے۔ ان میں سے ہر شخص مختص النوع خصائص ادبی کے ساتھ اپنے اپنے دائرہ کا آپ مالک ہے، اور جس طرح ادب القدماء (یعنی کلاسکیس) آج واجب التعظم سمجھا جاتا ہے۔ ایک وقت آئیگا جب ان کے ادبیات کا بیشتر حصہ لائق پرستش اور غیر فانی سمجھا جائیگا۔'' ''نور جہاں'' ''جہانگیر ایک روز مہر النسا کے کمرے میں جانکلا جو ضیائے حسن سے ''شیش محل'' بنا ہوا تھا۔ حور وش کنیزوں کے حلقہ میں زرق برق لباس آنکھوں کو خیرہ کئے دیتا تھا۔ فطرت کی لاڈلی ہمہ غمزہ، ہمہ عشوہ، ہمہ ناز نہایت سادے باریک سفید لباس میں تھی۔ لیکن شیشے کی طرح صاف شفاف جسم جھلک رہا تھا۔ ''مقیاس الشباب'' کی سرکشی بتا رہی تھی کہ وہ دستانے کی طرح چھپی ہوئی محرم سے زیادہ اودی اُودی رگوں کے پیچ و خم اور اعصاب کی قدرتی کھینچ تان کی ممنون ہے۔ اس پروہ کافوری برہنہ حصہ افتی! خیال کے لیے باقی رہا؟ غرض مہر النسا عالم تصویر بنی ہوئی تھی۔ شاہی نگاہیں جم کر حسن عریاں کا جائزہ بھی نہ لینے پائی تھیں کہ ایک کہربائی قوت نے بجلی کے تاروں میں نہیں زلف عنبریں کے پیچوں میں ''جہاں پناہ'' کو جکڑنا شروع کیا، شاہانہ تمکنت نے دیکھتے دیکھتے حُسن گلوسوز سے شکست کھائی۔ ''جہانگیر'' سے ضبط نہ ہوسکا۔ دل کا چور زبان پر یوں آیا۔'' حسین عورت جو صورت کے ساتھ حسن سیرت بھی رکھتی ہو اور جس میں نسائیت کوٹ کوٹ کر بھری ہو انسانی تخیل کا بہترین مرقع ہے۔ عورت ایک خوبصورت گلدستہ ہے جس کی ساخت میں نہایت نازک پھول، پتیاں، صرف ہوئی ہیں۔ جس طرح پھول کی پتیوں میں نازک رگیں، نسیں اور باریک نقش و نگار ہوتے ہیں، عورت کا دل و دماغ بھی اسی طرح کی لطافتوں اور نزاکتوں کا مخزن ہوتا ہے جس کے بیل بوٹے قدرت کی بہترین نقاشی ہیں۔ عورت فسانہ زندگی ہے، وہ ایک جھونپڑے کو اپنی شفاف ہستی سے ''شیش محل'' بناسکتی ہے۔ بڑے سے بڑے ایوان عیش کی تکمیل اس وقت تک ممکن نہیں، جب تک تیری موجودگی کے آثار اس میں نہ پائے جائیں۔ عورت دنیا میں فطرت کی تکمیل کے لئے آئی۔ اسی لئے مہذب دنیا میں اسے انسان کا ''نصف بہتر حصہ'' کہتے ہیں۔ محبت، دلسوزی، خلوص و ہمدردی اس کا خاصہ فطری ہے۔ یہ جہاں ہماری خوش دلی کو بڑھاتی ہے، رنج و غم کو بانٹ لیتی ہے، صحت میں رفیق زندگی، علالت میں خوش سلیقہ تیماردار، اور موت کے بعد ہماری خوبصورت ''سوگوار'' ہے۔''

(افاداتِ مہدی ۱۹۲۳ء)



میر ناصر علی

(۱۸۴۷-۱۹۳۳ء)

آپ ۱۸۴۷ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ دہلی کالج میں تعلیم پائی اور وہیں ۱۹۳۳ء میں انتقال ہوا۔ میر ناصر علی ان ادیبوں میں تھے جو صرف ادارت اور مضمون نگاری کے سبب نامور ہوئے۔ زبان وادب کا فطری ذوق رکھتے تھے۔ کوئی کتاب نہیں لکھی لیکن اپنے رسالہ ''صلائے عام'' کے ذریعے جو دہلی سے ۱۹۰۸ء میں جاری کیا تھا، صحیح زبان، دلکش اسلوب اور پاکیزہ خیالات کے نمونے پیش کئے ہیں۔ ادبی دنیا میں ان کے مقالات کی بڑی دھوم تھی۔ میر صاحب شاعر نہ تھے لیکن نثر میں شاعری کرتے تھے۔ ان سے پہلے مولانا محمد حسین آزاد نے نثر کی شاعری ''نیرنگ خیال'' میں ایسی کی کہ کمال کی حد کردی۔ ناصر علی کے مضامین اپنی نازک خیالی اور پاکیزہ بیانی کے باعث اردو ادب میں ''کلاسیک'' کا درجہ رکھتے ہیں۔ وہ اپنے رسالہ ''صلائے عام'' میں لکھتے ہیں۔ ''خیال بمقابلہ زبان۔ ''صلائے عام'' میں خاص بات یہ ہے کہ اس میں خیال کی تلاش زیادہ رہتی ہے۔ زبان کے قائل تو ایسے لوگ بھی ہیں جو لیاقت علمی سے خالی ہوں۔ مگر خیال کی داد دینے کے لئے علم ولیاقت کی ضرورت ہے۔ اس لئے اہل علم وکمال میں خیال کی خوبی کو زبان کی خوبی پر ترجیح دی جاتی ہے۔ زبان کے سمجھنے والے زیادہ ہوتے ہیں۔ کیونکہ زبان کا سمجھنا آسان ہے۔ مضمون پیدا کرنے میں جو خون جگر کھانا پڑتا ہے، اس کے سمجھنے کے لئے دل ودماغ چاہئے اور دل ودماغ ہر وقت بازار میں نہیں ملتے''۔ ''اخبار والے جن کو سخن گستری کا شوق ہے سال کے انجام وآغاز کے دو مضمون ذرا زور سے لکھتے ہیں لیکن میں انجام وآغاز کو ''عرس'' ''سالگرہ'' سے تشبیہ دیتا ہوں''۔ ''۳۱ ردسمبر کو تو گویا پیر گردوں کا عرس سمجھئے اور یکم جنوری کو گردشِ روزگار کی سالگرہ۔ ہر سال کا آخر میری نگاہ میں زمانہ کا عرس ہے اور یکم جنوری کو گردشِ روزگار کی سالگرہ منائیں کہ دنیا کا مدار اسی پر ہے اور اتفاقات زمانہ سے پیر گردوں کی سالگرہ کا دن یہی تھا جو گردش روزگار کی سالگرہ کا دن ہے کہ آغاز عالم میں تمام کائنات (ہوجا) سے پیدا ہوئی۔ پیر گردوں کی سالگرہ کی یادگار ''کہکشاں'' آسمان پر موجود ہے''۔ (اب میر ناصر علی انگریزی انشا پردازوں کے چند خیالات پیش کرتے ہیں)۔ ''کسی کے غم میں موت سے کوئی کہہ رہا ہے کہ تو مرنے والے کے ساتھ تو زبردستی کرگئی، بھلا میرے ساتھ تو کر کہ مرنے والے کی یاد چھین تو لے''۔ عقل سے عشق نے کہا کہ اکیلے تو میں تجھ سے لڑنے کو تیار ہوں کہ ایک کی لڑائی ہے۔ مگر تیرے ساتھ اگر دختر رز (شراب) ہوگی تو پھر تیرا مقابلہ مشکل ہے''۔ ''یونانی حسینہ جس کی جوانی کا انحطاط قریب ہے زہرہ کے مندر پر آئینہ چڑھانے گئی۔ چڑھاتے وقت کہتی ہے کہ ''آئینہ کی اب مجھے ضرورت نہیں۔ جیسی میں پہلے تھی وہ صورت تو اب آئینہ میں کاہے کو نظر آئے گی، جو شکل ہونے والی ہے اس کو دیکھ کر کیا کروں گی؟ جوانی کے بعد میری صورت ہوگی وہ مجھ سے نہیں دیکھی جائے گی، جیسی تھی پھر دکھائی دے چکی۔ اب آئینہ کو رکھ کر کیا ہوگا؟ یہی آئینہ جو حسینوں کے ہاتھ سے نہیں چھوٹتا، جوانی کے بعد اس کی شکل سے نفرت ہوجائے گی''۔ (اب میر ناصر علی بے ثباتی عالم بیان کرتے ہیں) انگریزی میں کسی شاعر کا مضمون ہے کہ حُسن اس لئے دلفریب ہے کہ ہماری ہستی کی طرح بے ثبات ہے اور علم کی قدر ہماری نگاہ میں اس لئے ہے کہ اس میں کمال مشکل ہے۔ مرنے کے بعد کسی چیز کو کمال حاصل ہو تو عالم اسباب میں کمال کی قدر نقص سے ہے او رہنر کی قدر عیب سے۔ بیداری کی قدر غفلت سے اور زندگی کی قدر موت سے۔ بچے جن کھلونوں پر جان دیتے ہیں جوان انہیں پھینک دیتے ہیں اور جوانوں کو جو باتیں عزیز ہیں بوڑھے انہیں فضول سمجھتے ہیں۔ لیکن مجھ سے پوچھئے تو اس عالم کی مختصر سے مختصر زندگی مرنے کے بعد قیامت تک زندہ رہنے سے کہیں اچھی ہے''۔ (رسالہ صلائے عام دہلی)



نواب مرزا داغ دہلوی
(۱۸۳۱-۱۹۰۵ء)

نواب مرزا داغ دہلوی کی پیدائش ۱۸۳۱ء دہلی میں ہوئی۔ ان کی حیات سے قبل زبان کی ہیئت کا طرز وادا جو بھی تھا اس کو نظر انداز کر کے اگر دیکھا جائے تو اُردو کی مقبولیت بلکہ مرکزیت دبستانِ دہلی کو جو حاصل ہوئی ان کے معاصرین میں ناسخ (۱۷۷۲ء۔۱۸۳۸ء)، شاہ نصیر (م ۱۸۳۸ء) کے سبب بتائی جاتی ہے۔ ان کے علاوہ اُستادِ ذوق دہلوی ۱۷۹۰ء۔۱۸۵۴ بھی اُستادِ فن میں شمار کیے جاتے تھے۔ نیز آزردہ صدرالدین (۱۷۸۹ء۔۱۸۶۸ء)، امام بخش صہبائی، ماسٹر رامچندر، ولی اللہ، مومن خاں، فضل الحق خیر آبادی اور غالب دہلوی ایک ہی طرز وادا کے بساطِ شاعری کے ہم نوا تھے۔ پھر بھی اُس دور کے یہ تین نام بہت اہم ہیں۔ مومن خاں (م ۱۸۵۱ء) ذوق (۱۸۵۴ءم) اور غالب (م ۱۸۶۹ء) ان میں ذوق کی اُستادی مسلمہ تھی۔ ان کے یہاں ادبی شائستگی، لطافتِ ذہنی اور حلاوتِ زبان کا حصّہ زیادہ تھا۔ ذوق کو شرف، اُستادی، بہادر شاہ ظفر کا بھی حاصل تھا۔ شاہ ظفر کے علاوہ ذوق کے اور شاگرد بھی تھے جو اپنا ایک مقامِ خاص رکھتے تھے۔ ان میں مرزا داغ دہلوی مقبول تلامذہ میں گزرے ہیں۔

اسی طرح مرزا داغ دہلوی کے شاگردوں میں بڑے نام آور، مہذب اور صاحبِ بصیرت تلامذہ گزرے ہیں۔ مثلاً علامہ سر محمد اقبال، (۱۸۷۳ء۔۱۹۳۸ء) مولانا سید علی احسن، احسن مارہروی (۱۸۷۶ء۔۱۹۴۰ء) ان کے علاوہ حضرت نوح ناروی (۱۸۷۸ء۔۱۹۶۲ء) مشہور و مقبول تلامذہ تھے۔ داغ لال قلعہ دلّی، رامپور کے بعد نظامِ دکن سے وابستگی کے بعد پھر حیدر آباد سے کہیں اور نہ گئے۔ ان کی قدر و منزلت بھی افرادِ دکن نے بہت کی۔ انعام واکرام کے سوا خلعت، خطابات خاص سے بھی نوازے گئے۔ یہاں تک کہ اس شعر کے مصداق ؎

اب داغ کا ہمرنگ زمانے میں کہاں ہے　　بوڑھوں میں وہ بوڑھا ہے جوانوں میں جواں ہے

یعنی داغ نے حیدر آباد ہی کو نوازا۔ اور دلّی کی خاک دکن کا حصّہ بن گئی۔!

مرزا داغ دہلوی کی شوخیِ کلام، روانیِ بیان اور ان کے تیکھے پن، رنگینیِ مزاج کے سبب ان کے کلام میں بے حد کشش ہے جس میں داغ کی مقبولیت کا راز پنہا ہے۔ داغ کے عظمتِ کلام کا یہ عالم تھا کہ اُردو کے بڑے فلسفی شاعر اور مفکر و وجدانی یعنی علامہ اقبال بھی ان کے دامنِ تلمذ سے وابستہ رہے۔ اور زندگی کے آخری لمحے تک اقبال نے اپنے کو وابستہ داغ رکھنا گوارا کیا۔ اس کے اسباب کیا تھے۔ اس لئے کہ اُس وقت امیر مینائی (۱۸۲۹ء۔۱۹۰۰ء)۔ مجروح۔ جلال جیسے باکمال شعراء بھی بساطِ ادب پر فائز تھے مگر جو شعری محاسن مرزا داغ کے یہاں تھے وہ اس دور کے نئے شعراء کو زیادہ متاثر کرنے والے تھے۔ یہی سبب ہے کہ زبان بیان کے بہتر پیرو اپنے دور کے کسی اور شاعر کو سوائے داغ کی شاگردی کے کسی کو زیادہ پسند نہ کرتے تھے۔ داغ کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

اُردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ　　ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

داغ کا یہ شعر تاریخی ہے اور حقیقی ؎

کسی کو مل کے تڑپانا، کسی کو کھینچ کے ترسانا　　یہی دو ایک جو ہر خنجر قاتل میں رہتے ہیں
کوئی نام ونشاں پوچھے تو اے عاشق یہ کہہ دینا　　تخلص داغ ہے وہ عاشقوں کے دل میں رہتے ہیں

زبان، کھڑی بولی اور برج کی شائستگی بھی داغ کے یہاں ملتی ہے۔ داغ دلّی کی زبان برمحل استعمال کرنے کے

گر سے واقف تھے۔ ان کی زبان سادہ، طرزِ ادا رواں، دلچسپ اور پُر اثر ہوتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ تخلیقی عناصر اور لذتِ زبان کو داغ نے ہمیشہ مدنظر رکھا۔ وہ موزوں الفاظ اور قواعد زبان کے سو امضمون کے وارستہ کرنے کے قائل تھے۔ مقفع اور مسجع الفاظ کے بجائے طرزِ نگارش سادہ رکھنے کے ہم خیال تھے۔ اور سادگی بھی ایسی جس میں سلاست، روانی، برجستگی کے سوا دلچسپی بھی ہو۔ داغ شعر کو ادق بنانے کے قائل نہ تھے۔ محاورہ بھی وہ استعمال کرتے تھے جو زبان سے میل کھائے اور قربت قریہ رکھے۔ دراصل مغل تہذیب نے جو شائستگی کی فضا ہموار کی تھی، اس کا تقاضا تھا کہ زبان ہلکی پھلکی اور شائستہ ہو۔ اور ہندوی زبان کے قریب ہو۔ ہندوی سے مراد دراصل وہ زبان ہے جو پنجاب اور اس کے ارد گرد بولی جاتی ہو۔ اس ذیل میں تاریخی طور پر ۱۲۰۰ء سے لیکر ۱۳۵۰ء تک حکومت کا نظام شمالی ہند میں رہا۔ اور یہ دور اسلامی حکومت کا دور تھا۔ اس بیان سے مقصود یہ ہے کہ اُردو کی نشو ونما اور اس کے رائج کرنے میں، جن ادباء اور شعراء نے حصہ لیا ان میں آخر آخر دور حکومت (اسلامی) مغلیہ نے جس کو مفخر کیا۔ تو اسی نے زبان کو بھی متاثر کیا۔

اس اعتبار سے اگر سرسری جائزہ لیا جائے تو ہم کو داغ کی اہمیت، شخصیت اور ان کی فکر کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔ اور ان کے تلامذہ کی، ادبی، فکری بلکہ شعوری زبان و قواعد کی تہذیبی فکروں کو مدنظر رکھا جائے تو اندازہ ہوگا کہ علامہ اقبال سے زیادہ مولانا احسن مارہروی نے اپنے اُستاد داغ کی زبان و خیال اور فکری سطح کو ہمیشہ پیش نظر رکھا۔ یہی سبب ہے کہ اُستاد داغ کی رحلت کے بعد بھی اپنے کو اُستاد محترم سے انھوں نے وابستہ رکھنا لازمی خیال کیا۔ چنانچہ داغ کا نام، ان کا کلام اور اس کی طبع سے وابستگی رکھی اور اُستاد داغ کی وفات کے بعد بھی ان کے عزیز شاگرد احسن مارہروی نے ان کے کلام نثر و نظم کو نئی جہت بخشنی ضروری خیال کیا۔ اور داغ کے کلام کو اپنی حیات کے آخری لمحہ تک منظرِ عام پر لانا واجب جانا۔ چنانچہ داغ کی جملہ تحریروں کی طباعت ان کے شاگرد کا اصل کارنامہ ہے۔ جسے انھوں نے انجام دینا لازمی جانا۔ اور آج جو کچھ سرمایہ علمی داغ کا ہمارے سامنے ہے وہ کارنامۂ احسن ہے۔ مرزا داغ کی جو تصانیف احسن مارہروی نے شائع کیں، ان میں سے مقبول کتب کی فہرست ملاحظہ ہو۔

جلوہ داغ، سوانح مرزا داغ، یادگار داغ، انشائے داغ، منتخب داغ، اور فصیح اللغات وغیرہ ہیں۔ اس کے بعد داغ کے کچھ اشعار ان کی زبان دانی اور شعوری فکر کا نتیجہ ہیں۔

شبِ ہجراں سے موت بہتر ہے | خواب آرام سے تو آئے گا
کبھی اپنا بھی دور خوش اے داغ | دور ایام سے کرائے گا

اُردو کے اس فدائی شاعر نے اُردو زبان کے سلسلے میں جو اشعار کہے وہ اپنا ثانی نہیں رکھتے۔

ل نواب مرزا داغ ولد نواب شمس الدین خاں رئیس لوہارو کے فرزند تھے مگر باپ کا سایہ چھ سال کی عمر میں گزر گیا تو ان کی ماں نے بہادر شاہ ظفر کے بیٹے ولیعہد فتح الملک عرف مرزا فخرو سے عقد کر لیا۔ اس طرح مرزا داغ کا بچپن بلکہ جوانی کا ابتدائی حصہ لال قلعہ میں گزرا۔ لیکن مرزا فخرو نے مرض ہیضہ میں انتقال کیا۔ پھر بساط بادشاہت اُلٹ گئی، نہ لال قلعہ رہا، نہ ہی اس کے افراد۔ یہاں تک کے نواب یوسف علی خاں ناظم رامپور نے اپنی سرپرستی میں داغ کو لے لیا۔ ۱۲۸۹ھ میں داغ نے نواب رامپور کی ہمرکابی میں حج کا فریضہ ۴۳ سال کی عمر میں ادا کیا۔ نواب رامپور کی وفات کے بعد آپ دلّی آ گئے۔ مگر ۱۸۸۸ء میں فرمان نظام حیدر آباد کے تحت حیدر آباد تشریف لے گئے اور ۱۳۰۵ھ سے ۱۳۲۲ھ تک وابستہ مملکت نظام رہ کر ۹ رذی الحجہ ۱۳۲۲ھ کو مرض فالج میں بعد مغرب رحلت کی۔ اتفاق ہے کہ داغ جس مہینے، جس ہفتہ پیدا ہوئے تھے اسی مہینے اور اسی ہفتہ میں اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ وفات کے دوسرے روز ۱۰ رذی الحجہ کو نماز بقر عید کے بعد مکہ مسجد میں نماز جنازہ ادا کی گئی اور یوسف شریف کی درگاہ میں، ان کی اہلیہ کے قریب تدفین کی گئی۔ مرزا داغ کی تاریخ وفات بھی ان کے نام "نواب مرزا داغ" سے نکلتی ہے۔



مولانا ابوالکلام آزاد

(۱۸۸۸ـ۱۹۵۸ء)

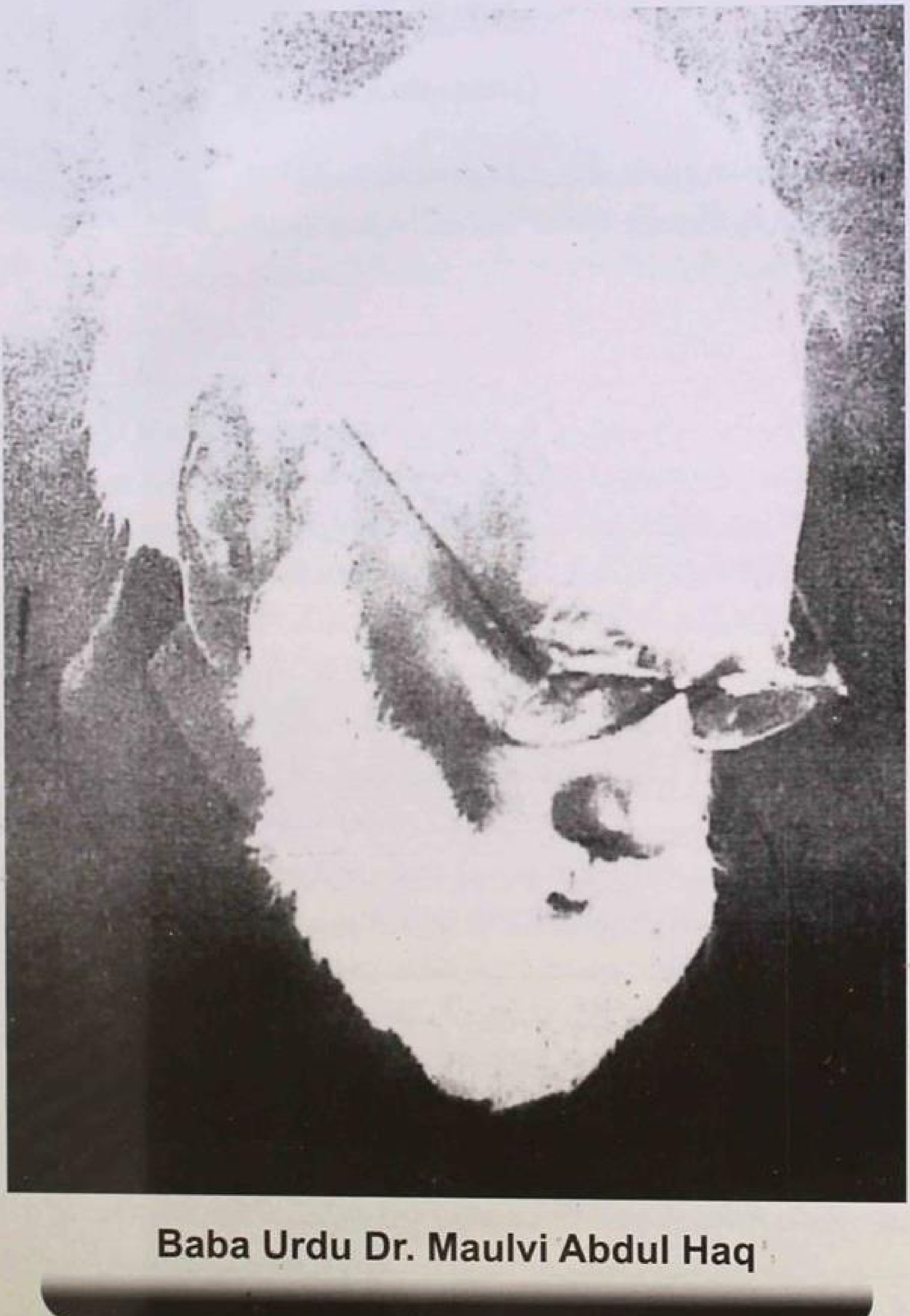
محی الدین احمد نام، آبائی وطن دہلی، ان کے والد مولانا خیرالدین، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد ملک کی تباہی و بربادی سے دل برداشتہ ہو کر مکہ معظمہ چلے گئے تھے۔ وہیں ۱۸۸۸ء میں آزاد پیدا ہوئے۔ اور ۱۹۵۸ء میں بمقام دہلی وفات پائی۔ حجاز و مصر میں تعلیم حاصل کی۔ ان کے والد بھی جید عالم تھے اور ان کے بزرگ بہلول دہلوی عہدِ اکبری کے مشہور علما میں تھے۔ آزاد نے ہندوستان آنے کے بعد کلکتہ میں رہائش اختیار کی اور رسالہ ''الہلال'' نکالا جس کے خاص اسلوب تحریر اور طرز ادا نے اردو ادب میں حیرت انگیز انقلاب برپا کر دیا۔ پھر ''البلاغ'' جاری کیا۔ مولانا ہندوستان کے مشہور سیاست دان، مصنف، مقرر اور زبردست اہل قلم تھے۔ ان کی تحریر میں علمی شان، بیان میں شوکت و رعنائی اور زبان میں متانت کے ساتھ بانکپن بھی ہے۔ مولانا اردو کے بہترین انشا پرداز تھے جس پر اردو ہمیشہ ناز کرے گی۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ ''تفسیر قرآن'' ہے۔ شہادت حسینؑ ''(دنیا میں ہر چیز مر جاتی ہے کہ فانی ہے، مگر خونِ شہادت کے ان قطروں کے لئے جو اپنے اندر ''حیات الٰہیہ'' کی روح رکھتے ہیں کبھی فنا نہیں)''۔ ''حسینؑ نے سر دے دیا کہ انسان کے پاس یہ ایک آخری متاع ہے۔ لیکن اس عظیم الشان حکومت قاہرہ و جابرہ (یزید) کا مقابلہ کیا، جس کے حدودِ سلطنت، ملتان اور سرحد فرانس تک پھیلے ہوئے تھے''، ''فتح اس کی تھی اور فیروز مندی و کامرانی کا ''تاج'' اس کے زخم خوردہ سر پر رکھا جا چکا تھا۔ وہ تڑپا اور خاک و خون میں لوٹا۔ پر اپنے اس خون کے ایک ایک قطرہ سے جو عالمِ اضطراب میں اس کے زخموں سے رگِ سنگ پر بہا تھا، انقلاب و تغیرات کے وہ سیلاب ہائے آتشیں پیدا کر دئے جن کو نہ تو مسلم بن عقبہ کی خوں آشامی روک سکی، نہ حجاج بن یوسف کی بے امان خونخواری اور نہ عبدالملک کی تدبّر و سیاست۔ وہ بڑھتے ہی رہے۔ ظلم و جبر کا پانی تیل بن کر ان کے شعلوں کی پرورش کرتا رہا اور حکومت و تسلّط کا غرور ہوا بن کر ان کی ایک چنگاری کو آتشکدہ سوزاں بناتا رہا۔ یہاں تک کہ آخری وقت آ گیا اور جو کچھ ۶۱ھ میں کربلا کے اندر ہوا تھا، وہ سب کچھ ۱۳۲ھ میں نہ صرف دمشق بلکہ تمام عالم اسلامی کے اندر ہوا۔ بنی امیہ کے صاحبان تاج و تخت خاک و خون میں تڑپے۔ فتحمندوں (عباسیوں) نے قبریں تک اکھاڑ ڈالیں اور مردوں کی ہڈیوں تک کو ذلت و حقارت سے محفوظ نہ چھوڑا۔ اور اس طرح ''(بہت جلد ظالم لوگ اس بات کو جان لیں گے کہ کس جگہ وہ لوٹائے جائیں گے)'' (قرآن مجید)۔ کا پورا پورا ظہور ہوا'' (شہادت حسینؑ مطبوعہ لاہور ۱۹۵۰ء)۔ تاج۔ ''حسن آواز میں ہو یا چہرے میں، تاج محل میں ہو یا نشاط باغ میں، حسن ہے اور حسن اپنا فطری مطالبہ رکھتا ہے)''۔ ''رات کا سناٹا، تاروں کی چھاؤں ڈھلتی ہوئی چاندنی اور اپریل کی بھیگی ہوئی رات، چاروں طرف ''تاج'' کے منارے سر اٹھائے کھڑے تھے۔ بُرجیاں دم بخود بیٹھی تھیں۔ بیچ میں چاندنی سے دھلا ہوا مرمریں گنبد اپنی کرسی پر بے حس و حرکت متمکن تھا۔ نیچے جمنا کی روپہلی جدولیں بل کھا کھا کر دوڑ رہی تھیں اور اوپر ستاروں کی ان گنت نگاہیں حیرت کے عالم میں تک رہی تھیں۔ نور ظلمت کی اس ملی جلی فضا میں اچانک پردہ ہائے ستار، سے نالہ ہائے، بے خوف اٹھے اور ہوا کی لہروں پر بے روک تیرنے لگے۔ آسمان سے تارے جھڑ رہے تھے اور میری انگلی کے زخموں، سے نغمے۔ کچھ دیر تک فضا تھمی رہی۔ گویا کان لگا کر خاموشی سے سن رہی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ ہر تماشائی حرکت میں آنے لگا۔ چاند بڑھنے لگا۔ یہاں تک کہ سر پر آ کھڑا ہوا۔ ستارے دیدے پھاڑ پھاڑ کر تکنے لگے۔ درختوں کی ٹہنیاں کیفیت میں آ آ کر جھومنے لگیں۔ رات کے سیاہ پردوں کے اندر عناصر کی سرگوشیاں صاف صاف سنائی دیں۔ بارہا 'تاج' کی بُرجیاں اپنی جگہ سے ہل گئیں اور کتنے ہی مرتبہ ایسا ہوا کہ منارے اپنے کاندھوں کی جنبش نہ روک سکے۔ آپ باور کریں یا نہ کریں۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ اس عالم میں بارہا میں نے برجیوں سے باتیں کی ہیں اور جب کبھی 'تاج' کے گنبدِ خاموش کی طرف نظر اٹھائی ہے تو اس کے لبوں کو ہلتا ہوا پایا ہے۔'' (غبار خاطر ۱۹۴۶ء)۔



خواجہ حسن نظامی

(۱۸۷۸-۱۹۵۵ء)

خواجہ صاحب ۱۸۷۸ء میں دہلی میں پیدا ہوئے اور وہیں ۱۹۵۵ء میں وفات پائی۔ ''مصورِ فطرت'' لقب پایا۔ خواجہ صاحب اردو میں خاص طرز کے موجد اور مشہور انشا پرداز ہیں۔ ان کی تحریر میں شہد کی سی مٹھاس، دلکشی، سادگی اور بے تکلفی ہوتی ہے۔ خواجہ صاحب کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ معمولی مضمون کو نہایت دلکش اور مؤثر بنا دیتے ہیں۔ زبان دلی کی ٹکسالی، سادہ، شگفتہ اور شیریں ہونے کی وجہ سے قبولِ عام حاصل کر چکی ہے۔ دہلی کی پرانی تہذیب و معاشرت اور مغلیہ شہزادیوں کے واقعات نہایت دردانگیز پیرائے میں بیان کئے ہیں۔ ''سی پارۂ دل'' میں ان کے پر اثر ادبی، اخلاقی اور صوفیانہ مضامین ہیں۔ علی اکبر ابن امام حسینؑ۔ ''فلکِ رسالت کا روشن ستارہ، جو برجِ ستم میں غروب ہو گیا۔ مستی شباب کا البیلا، یادِ حق کی نیم خوابی کا نشیلا، وہ جس کی چشم سرگیں کے سامنے تلواریں شرما کر گھونگٹ نکالتی تھی، جس کے قدِ رعنا کو دیکھ کر سیدھے نیزے جھک جاتے تھے، جس کے سینہ کی چکلان اور مضبوطی، فولادی ڈھالوں کو مات کرتی تھی، جس کی گردن خنجروں سے آنکھ لڑاتی تھی، جس کی زلفیں دام بچھاتی تھیں اور اپنے شانوں تک الجھاتی تھیں، وہ خمدار گیسوؤں میں شب کو غم کو ٹھوکریں کھلانے والا، وہ انگڑائی لے کر شیروں کو بے اوسان بنانے والا، وہ نعرہ مار کر دریائے فرات کو سہمانے والا، اسی خاکستان (کربلا) کی کمیں گاہ میں چھپا ہے۔'' (سی پارۂ دل) (۱۹۱۶ء) **شہزادی گل بانو**۔ ''غدر کے بعد درگاہ حضرت چراغ دہلی کے گوشہ میں ایک حسین دوشیزہ پھٹا ہوا کمبل اوڑھے رات کے وقت ہائے ہائے کر رہی تھی۔ سردی کا مہینہ، دھواں دھار مینہ برس رہا تھا۔ تیز ہوا کے جھونکوں سے بوچھاڑ اس جگہ کو تر کر رہی تھی جہاں اس دوشیزہ کا بستر تھا۔ یہ سخت بیمار تھی۔ پسلی کے درد، بخار اور بے کسی میں اکیلی تڑپتی تھی۔ مینہ سناٹے سے برس رہا تھا۔ بجلی چمکی تو ایک سفید قبر کی جھلک دکھائی دی جو اس کے باپ کی تھی اس دوشیزہ نے باپ کی قبر پر پہنچ کر ایک نعرہ مارا اور کہا۔ ''بابا میں آپ کی گل بانو ہوں، دیکھو اکیلی ہوں، مجھے بخار چڑھ رہا ہے۔ میری پسلی میں شدت کا درد ہو رہا ہے، مجھے سردی لگ رہی ہے۔ میری اماں مجھ سے بچھڑ گئیں۔ دادا حضرت (بہادر شاہ ظفرؔ آخری تاجدار دہلی) جلاوطن ہو گئے۔ میرا لال قلعہ کا چھپر کھٹ کیا ہوا۔ میری سیج کدھر گئی۔ میں نے پرسوں سے کچھ نہیں کھایا۔ میں اینٹ پر سر رکھے لیٹی ہوں۔ میرے بدن میں کنکر چبھ رہے ہیں۔ بابا، اٹھو، کب تک سوؤ گے۔ ہائے درد، اُفوہ، سانس کیوں کر لوں۔'' یہ کہہ کر باپ کی قبر سے لپٹی اور روح پرواز کر گئی۔'' (بیگمات کے آنسو) (۱۹۲۴ء) دعا۔ ''میرے مالک، پچھلی رات ہے۔ سب سوتے ہیں تُو جاگتا ہے، میں جاگتا ہوں، تو سامنے کے آسمان میں ہے یا خود میرے اندر کے مکان میں ہے۔ جہاں ہے میری التجا کو سن، صبح کا نور چمکنے سے پہلے، تاروں کی روشنی کے آسمان میں ہے یا خود میرے اندر کے مکان میں ہے۔ جہاں ہے میری التجا کو سن، صبح کا نور چمکنے سے پہلے، تاروں کی روشنی چھپنے سے بیشتر، پرندوں کی نغمہ خوانی سے قبل، میری مراد پوری کر دے۔'' جھینگر ''بے چارہ غریب تھا، خلوت نشیں تھا، خلقت میں حقیر و ذلیل تھا، خدا بخشے بہت سی خوبیوں کا جانور تھا۔ ہمیشہ دنیا کے جھگڑوں سے الگ کونے میں، کسی سوراخ میں، بوریے کے نیچے، آبخورے کے اندر چھپا بیٹھا رہتا تھا۔ نہ بچھو کا سا زہریلا ڈنک تھا نہ سانپ کا سا ڈسنے والا پھن، نہ کوے کی سی شریر چونچ تھی نہ بلبل کی مانند پھول کی عشق بازی، شام کے وقت عبادت رب کے لئے ایک مسلسل بین بجاتا تھا اور کہتا تھا کہ یہ غافلوں کے لئے صور ہے اور عاقلوں کے لئے جلوۂ طور۔'' (سی پارۂ دل) (۱۹۱۶ء)



Baba Urdu Dr. Maulvi Abdul Haq

(۳۳)

بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق

(۱۸۷۴-۱۹۶۱ء)

بابائے اردو ۱۸۷۴ء میں ضلع میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۶۱ء میں کراچی میں وفات پائی۔ ۱۸۹۸ء میں علی گڑھ سے بی، اے پاس کیا اور وہیں سرسیّد اور مولانا حالی سے صحبتیں رہیں۔ پھر عثمانیہ کالج اورنگ آباد کے پرنسپل اور حیدرآباد دکن میں جامعہ عثمانیہ کے صدر شعبۂ اُردو مقرر ہوئے۔ پچاس سال تک انجمن ترقی اُردو کے سیکرٹری رہے۔ ۱۹۳۵ء میں انجمن کا دفتر حیدرآباد دکن سے دہلی منتقل کیا اور آزادی ۱۹۴۷ء کے بعد دہلی سے کراچی چلے گئے۔ انہوں نے اپنی تمام عمر اُردو کی خدمت میں گزار دی اور نوے سال کا یہ معمر جرنیل کاروانِ اُردو کو لئے ہوئے شاہراہ ترقی پر گامزن رہا۔ مولوی عبدالحق کی نثر میں ایک خاص قسم کی پختگی ہے جس میں دِلّی کی ٹکسالی زبان کا رنگ خاص طور سے جھلکتا ہے۔ اِن کی طرزِ تحریر متین، پُروقار، سنجیدہ اور آسان ہے۔ بحیثیت ''زبان دان'' اور ''نقاد'' اِن کا درجہ بہت بلند ہے۔ ''مقدماتِ عبدالحق'' ادب اُردو میں بلند مرتبہ رکھتے ہیں۔ انجمن ترقی اُردو نے اِن کی نگرانی میں بے مثال تصانیف شائع کی ہیں۔ زبان۔ اگر آپ دُنیا کی تاریخ پر نظر ڈالیں گے تو معلوم ہوگا کہ قوموں کو اپنی زبان کے لئے کیسی خوفناک جنگ و جدل اور کش مکش کرنی پڑی ہے۔ فاتحوں یا غالبوں نے سب سے پہلے مفتوحوں یا مغلوبوں کی زبان [1] کو مٹانا چاہا۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ زبان کے کچل دینے سے قومیت خُود بخود نابُود ہو جائیگی۔ لیکن مفتوح اور مغلوب نے ہر قسم کی مصیبت، ایذا، تعذیب جھیلی، مگر اپنی زبان نہ چھوڑی۔ جب حکومت نے پڑھنا، لکھنا، بولنا ممنوع قرار دیا تو زبان کے فدائی چھپ چھپ کر، دروازے بند کر کے تہ خانوں میں جا جا کہ پڑھتے اور لکھتے تھے۔ باوجود ہر قسم کی آفات و مصائب و آلام کے وہ اپنی زبان بچالے گئے اور وہی زبانیں جو ایک زمانے میں مردُود تھیں، اب مقبول ہیں'' ''اب ہمیں اگر اپنی قومیت، تہذیب و تمدن و روایات کو بچانا منظور ہے تو اپنی زبان (اُردو) کو بچانے کی فکر کرنی چاہئے۔ مخالفین نے ہمیں بہت سی نعمتیں دی ہیں۔ اگر خدانخواستہ اِس دَور میں جیسے ہندوستان میں آثار پائے جاتے ہیں اور اُردو پر پہلے بھی کئی نازک دَور گزر چکے ہیں، اُردو کی مخالفت ہوئی تو وہ بہت شدید ہوگی۔ ہم اس کے لئے تیار ہیں اور یقین رکھتے ہیں کہ ہماری زبان مخالفت کی اس آگ میں سے زیادہ نکھر کر نکلے گی، پہلے سے زیادہ عُروج اور ترقی نصیب ہوگی۔'' (خطبات عبدالحق ۱۹۴۶ء) تنقید جس قدر عام ہے اُسی قدر مشکل ہے۔ تنقید پر صرف وہی لکھ سکتا ہے اور دُوسروں کو ہدایت کر سکتا ہے جس کا تجربہ وسیع، مطالعہ گہرا اور نظر دُور بیں ہو۔ جو صرف ذوق ہی صحیح نہ رکھ سکتا ہو، بلکہ دریائے ادبیات کا شناور بھی ہو جس نے ایک مُدّت کے مُطالعہ اور غور و فکر کے بعد اُن اُمور کے متعلق خاص رائے قائم کی ہے وہ اس رائے کو بیان کرنے کی قُدرت رکھتا ہے اور دُوسروں کے دلنشیں کر سکتا ہے۔ ہماری زبان میں یہ کام صرف مولانا حالی مرحوم نے کیا ہے۔ فن کی حیثیت سے وہ اس کے بانی ہی نہیں، بلکہ ایک اعلیٰ پایہ کے ادبی نقاد ہیں اور جن کی تحریریں ہمیشہ بڑی وقعت اور قدر سے دیکھی جائیں گی۔'' ''غالب کا کلام ایک لازوال نعمت ہے۔ جُوں جُوں زمانہ گزرتا جاتا ہے، اِس کی قدر اور بڑھتی جاتی ہے۔ جب تک اُردو زبان زندہ ہے اِس کے زندہ رہنے میں کلام نہیں۔ بلکہ اگر یہ نہ بھی رہے تو بھی کلام زندہ رہیگا۔ کیونکہ اس کا کمال محض الفاظ و زبان پر منحصر نہیں ہے، بلکہ قیود سے بالا و برتر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی متعدد شرحیں لکھی جا چکی ہیں اور آئندہ سینکڑوں لکھی جائیں گی اور فاضل شارح اس کے کلام کے سائے میں اپنی جدّت اور ذہانت کے موقعے ڈھونڈیں گے اور بقائے دَوام کا وثیقہ سمجھیں گے۔'' (تنقیدات عبدالحق ۱۹۲۸ء) ''جب کبھی مجھے ''نام دیو مالی'' کا خیال آتا ہے تو میں سوچتا ہوں کہ نیکی کیا ہے اور بڑا آدمی کسے کہتے ہیں؟ ہر شخص میں قُدرت نے کوئی نہ کوئی صلاحیت رکھی ہے۔ اس صلاحیت کو درجۂ کمال تک پہنچانے میں ساری نیکی اور بڑائی ہے۔ درجۂ کمال تک نہ کوئی پہنچا ہے اور نہ کبھی پہنچ سکتا ہے لیکن وہاں تک پہنچنے کی کوشش ہی میں انسان، انسان بنتا ہے، یہ سمجھو کندن ہو جاتا ہے۔ حساب کے دن جب اعمال کی جانچ پڑتال ہوگی تو خدا یہ نہیں پوچھے گا کہ تُو نے کتنی عبادت کی، وہ کسی کی عبادت کا محتاج نہیں۔ وہ پُوچھے گا تو یہ پوچھے گا کہ میں نے جو استعداد تجھ میں ودیعت کی تھی اُسے کمال تک پہنچانے اور اُس سے کام لینے میں تُو نے کیا کیا اور خلق اللہ کو اس سے کیا فیض پہنچایا۔ اگر نیکی اور بڑائی کا یہ معیار ہے تو ''نام دیو'' نیک بھی تھا اور بڑا بھی۔'' (چند ہم عصر ۱۹۴۲ء)

---

[1] ہندوستان میں بھی یہی ہوا کہ حکومت ملتے ہی اُردو کو نکال کر ہندی رائج کر دی گئی۔ مرتب



سیّد سُلیمان ندوی

(۱۸۸۴-۱۹۵۳ء)

آپ کی پیدائش ۱۸۸۴ء عظیم آباد پٹنہ میں ہوئی، وفات کراچی ۱۹۵۳ء، آپ کے والد کا نام حکیم سیّد ابوالحسن تھا۔ ندوۃ العلماء لکھنؤ میں تعلیم حاصل کی اور خوش قسمتی سے مولانا شبلی جیسے بے مثال ادیب، محقق اور مفکر استاد ملے۔ ان کی نظرِ انتخاب نے بھی انہی کو اپنا جانشین بنایا۔ عربی ادب و تاریخ کے ذوق نے ان کو بجائے طبیب کے ادیب بنادیا۔ مولانا شبلی نے بے بستر مرگ پران کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر ''سیرت سیرت'' کہا تھا۔ مولانا سلیمان نے یہ حق ادا کیا اور ''سیرت النبیؐ'' کی بقیہ چار جلدیں لکھیں اور ''حیاتِ شبلی'' لکھ کر استاد کی جانشینی کا حق ادا کیا۔ علامہ اقبالؒ نے ان کی کتاب ''خیام'' پر لکھا تھا۔ ''عمر خیام پر آپ نے جو کچھ لکھ دیا ہے اس پر اب کوئی مشرقی یا مغربی عالم اضافہ نہ کر سکے گا۔ الحمدللہ کہ اس بحث کا خاتمہ آپ کی تصنیف ''خیام'' پر ہوا۔ اس کے جواب میں مولانا نے لکھا۔ ''میں نے تو یہ کتاب (عمر خیام) محض اس اظہار کے لئے پیش کی تھی کہ اہلِ مغرب کو معلوم ہو جائے کہ ان کو جس ''ریسرچ'' پر ناز ہے، مشرقی علماء اس میں ان سے کسی طرح پیچھے نہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ ایسا ہی ہوا۔'' مولانا کی تحریروں میں علمیت اور ادبیت کے ساتھ ایک زور اور حلاوت پائی جاتی ہے۔ ''قرآن نے باطل پرستی کے ہر طلسم کو توڑ دیا۔ بتوں کے ہیکل مسمار کر دیئے۔ ستارہ پرستی کا چراغ گل کر دیا۔ انسانی جانوں کی قربانی موقوف کر دی۔ دختر کشی کی رسم کو ختم کر دیا۔ عورتوں کو عزت، غلاموں کو آزادی اور غریبوں کو بشارت دی اور سب کے لئے ایک ایمان اور عمل صالح کو ہر قسم کی ترقیوں اور سعادتوں کا زینہ بنایا اور بتایا کہ انسانی سعادت کی شاہراہ غاروں، خلوتوں اور پہاڑوں سے ہو کر نہیں گزری ہے، بلکہ شہروں، بازاروں، مجمعوں اور بھیڑ بھاڑوں کے اندر سے گزری ہے۔ حق کی نصرت، انسانوں کی بھلائی، یتیموں کی سرپرستی، غریبوں کی امداد، گرتوں کی دستگیری، مظلوموں کی فریاد رسی اور غلاموں کی آزادی ہی نیکیوں کی جڑیں ہیں اور اس راہ میں ہر قسم کی جدّ و جہد، زحمت کشی و محنت اور ایثار و قربانی اصلی نفس کشی و ریاضت ہے اور اسی نے مسلمانوں کو۔ اللہ کے ایک آستانہ قدس کے سوا دنیاوی قوت کے ہر آستانے سے بے نیاز کر دیا۔'' (مضامین سلیمان) (۱۹۵۰) ضمیر کی آواز ہر ''اچھے یا بُرے کام کے کرتے وقت اس کے دل کے پردہ سے تحسین یا نفرین کی آواز آتی ہے لیکن بُری صحبت، بُری تربیت یا کسی خاص شدید جذبہ کے اثر سے یہ آواز اور اس کا اثر دب بھی جاتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہر گناہ کے پہلے پہل کرنے میں انسان خوف کھاتا ہے اور اس کے ہاتھ پاؤں لرزتے ہیں۔ وہ اپنی گنہگاری کے تخیل سے شدید ذہنی اذیت محسوس کرتا ہے۔ وہ کبھی کبھی ندامت کے دریا میں غرق ہو جاتا ہے اس کے ذکر سے اس کی خجالت کی پیشانی عرق عرق ہو جاتی ہے۔ لیکن جب وہ بار بار اپنے ضمیر کی آواز سنتا ہے تو وہ دب کر رہ جاتی ہے اور اس کی پشیمانی اور ندامت کے احساس کا شیشہ اس ٹھوکر سے چور چور ہو جاتا ہے۔'' (سیرت نبی جلد ششم ۱۹۳۸ء) خیام۔ حافظ شیرازی کی طرح دنیا میں کتنے خوش قسمت بادہ پرست ہیں جن کی شراب کو لوگوں نے شراب معرفت سمجھا ہے۔ لیکن ایک بدقسمت خیام ہے کہ اس کی شراب کو دوست دشمن سب ہی بھٹی والی شراب سمجھتے ہیں اور انہوں نے یہ تصور کیا ہے کہ وہ ایک رند میخوار تھا جو ہمیشہ مست و سرشار رہتا تھا۔ جس کے ادھر اُدھر ٹوٹی صراحی اور پھوٹے پیمانوں کے ٹکڑے پڑے رہتے تھے۔ مگر کیا یہ واقعہ ایسا ہی ہے؟ دراصل ''ہارون رشید'' کے درباری شاعر ''ابونواس'' نے ''خمریات'' کی بنیاد ڈالی تھی۔ اس کے خمریہ اشعار آج تک وہی اثر رکھتے ہیں فارسی شاعری اسی زمانہ میں پیدا ہوئی۔ اس لئے اس کو تو گھٹی ہی میں شراب ملی۔ چنانچہ آج تک فارسی شاعری اسی نشہ سے چور ہے۔ خیام کے زمانے میں وہاں کی آب و ہوا اور ساری فضا میں شراب کا نشہ بھرا تھا۔ اس لئے زاہد و عابد اور عالم و فاضل سے لے کر رند و آزاد تک اگر شراب پیتا نہ تھا تو شراب بولتا ضرور تھا اور گل و بلبل کی طرح شراب و جام بھی تشبیہات و استعارات کا ضروری جزو بن گئے تھے۔ غرض یہ شراب کبھی شراب معرفت تھی، کبھی مے محبت بنی، آج بادہ وطن ہے۔'' (خیام ۱۹۲۳ء)



مولانا عبدالماجد دریابادی

(۱۸۹۲-۱۹۷۷ء)

مولوی عبدالقادر ڈپٹی کلکٹر کے فرزند ہیں۔ جو ۱۸۹۲ء میں پیدا ہوئے۔ نام عبدالماجد۔ وطن دریاباد ضلع بارہ بنکی ہے۔ ۱۹۱۲ء میں کیننگ کالج لکھنؤ سے بی۔ اے کیا۔ فلسفہ میں ایم۔ اے کے لئے علی گڑھ گئے۔ لیکن والد کے انتقال کی وجہ سے تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔ جب مولانا شبلی نے ''سیرت النبی'' کا دفتر لکھنؤ میں قائم کیا تو ان کو بھی شامل کر لیا۔ پھر ۱۹۱۷ء میں ''دارالترجمہ'' حیدرآباد دکن سے منسلک ہو گئے۔ اس کے بعد لکھنؤ سے یکے بعد دیگرے اخبار ''سچ''، ''صدق'' اور ''صدق جدید'' جاری کئے مستقل قیام اپنے وطن دریاباد میں رکھا۔ مولانا محمد علی سے محبت و عقیدت کے تعلقات بہت گہرے تھے اور مولانا اشرف علی تھانوی سے روحانی عقیدت تھی۔ ان کا مطالعہ فلسفہ بہت عمیق ہے۔ اسی لئے ان کی ادبی دنیا میں خاص شہرت ہے اور ''فلسفی'' کے لقب سے مشہور ہیں۔ ان کے علمی، ادبی، تنقیدی اور فلسفیانہ مضامین علمیت، شخصیت اور اعتدال پسندی میں یکتا ہیں۔ مولانا نے اردو ادب میں سنجیدہ ادب کا معتد بہ اضافہ کیا ہے۔ ان کی ذات اردو ادب کے لئے باعث فخر ہے۔ مولانا محمد علی[1] ''شب برات، ایک خیر و برکت والی رات ہے، کسے خبر تھی کہ یہ شب، شب قیامت یا نمونہ شب قیامت، بن سکتی ہے۔ مسلمان تو اس رات کو جاگ جاگ کر گزارتے ہیں۔ کون کہہ سکتا تھا کہ اب کی اسی رات کو نصیبہ سلا دیا جائیگا۔ زندگیاں مانگتے ہیں، صحتوں کے لئے گڑگڑاتے ہیں۔ کسے خیال تھا کہ عین اس وقت اسے (محمد علی کو) اٹھا لیا جائیگا۔ جس کے وجود سے ملت اسلامیہ کا وجود تھا۔ جس کی زندگی ساری قوم کی زندگی تھی اور جس کی موت اللہ کا نام جپنے والوں کی موت، محمدؐ کا کلمہ پڑھنے والوں کی موت ہے۔ آج محمدؐ کے نام کا عاشق زار رخصت ہو گیا۔ آج ماتم اس کا نہیں کہ ایک جادو بیان مقرر بہترین انشا پرداز گم ہو گیا۔ ماتم اس کا ہے کہ وہ گم ہو گیا جو سچائی کا پتلا تھا، جو حق گوئی کا مجسمہ تھا۔ حافظہ میں قرآن اور دل کے اندر اسلام کا سوز، دین کی تڑپ، ایک سوزش تھی کہ ہر وقت پھونک رہی تھی، ایک جوشش تھی کہ ہر آن خون کو کھولا رہی تھی'' (محمد علی حصہ دوم ۱۹۵۶ء) جذبہ لطیف ''جب ہم کسی سے بہ لطف و محبت پیش آنا چاہتے ہیں تو اس حالت کو جذبۂ لطیف کہتے ہیں۔ اس جذبہ کا لب لباب ایک کشش ہے جو ایک شخص کو دوسرے کی جانب معلوم ہوتی ہے اور پہلا شخص دوسرے سے کسی نہ کسی اتصال کی خواہش رکھتا ہے۔ ہاتھ ملانا، بغل گیر ہونا۔ اس کی خاص علامت۔ جسمانی یہ ہے کہ تمام رطوبت میں افزائش ہو جاتی ہے اور آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔ بعض وقت آنسو بھی نکل آتے ہیں''۔ مسرت۔ ''تمام جسم میں عموماً اور سر اور چہرہ میں خصوصاً دوران خون کی رفتار بہت تیز ہو جاتی ہے۔ چنانچہ حالت مسرت میں چہرہ پر رونق اور آنکھوں میں چمک کا آ جانا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ قلب کی حرکت انقباضی جلد جلد ہونے لگتی ہے۔ شرائین کے دہانے پھیل جاتے ہیں جس سے جلد میں ایک تازگی محسوس ہونے لگتی ہے۔ جسم تن جاتا ہے۔ آنکھیں بند ہو جاتی ہیں۔ جو لوگ خوش طبع اور خندہ جبیں ہوتے ہیں ان کی صحتیں عموماً اچھی اور عمریں اکثر زیادہ ہوتی ہیں اور جو لوگ عموماً افسردہ و محزوں رہا کرتے ہیں ان کی صحتیں خراب اور عمریں مختصر ہوتی ہیں۔ مسرت کے مختلف نام ہوتے ہیں۔ اگر طبیعت میں ہلکا لیکن مستمر، احساس مسرت رہتا ہو تو ''زندہ دلی'' یا خوش طبعی ہے۔ کسی آئندہ مسرت کی توقع ہو تو امید ہے''۔ ہمدردی۔ ''درد رسیدہ کی شرکت غم اسی کے لئے ممکن ہے جو خود بھی دل درد آشنا رکھتا ہو۔ عاشقانہ جانبازیوں کی داد وہی دے سکتا ہے جو خود بھی عاشقی کر چکا ہو۔ ایک عروس'' اس کا اندازہ نہیں کر سکتی کہ ''بیوگی'' کیا شے ہے'' (فلسفۂ جذبات ۱۹۱۴ء) توجہ۔ ''نور کی شعاعیں جب تک پراگندہ و متفرق رہتی ہیں۔ روشنی دھیمی رہتی ہے۔ لیکن جب کسی ایک نقطہ کو مرکز بنا لیتی ہیں تو روشنی بہت تیز ہو جاتی ہے۔ یہی حال توجہ کا ہے۔ ہمارے ارادے اسی وقت پختہ ہوتے ہیں جب ہم ان پر توجہ کریں'' (مبادی فلسفہ حصہ دوم ۱۹۳۴ء)

---

[1] تقریر مولانا محمد علی گول میز کانفرنس لندن ''میں ایک غلام ملک میں واپس نہیں جاؤں گا یا تو مجھے آزادیٔ ہند'' کا پروانہ دو، ورنہ قبر کے لئے دو گز زمین'' آزادی کا پروانہ جب نہ ملا تو مولانا محمد علی نے ایک غلام میں جانے کی بجائے ایک آزاد ملک میں زندگی کا آخری سانس لیا اور دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ۱۹۳۱ء میں ''بیت المقدس'' میں دفن ہوئے۔ خود فرما گئے تھے

ہے رشک ایک خلق کو جوہر کی موت پر   یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے   (مرتب)



نیاز فتح پوری

(۱۸۸۶-۱۹۶۶ء)

نیاز محمد خاں نام، فتح پور یو۔ پی وطن، ۱۸۸۶ء میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام محمد امیر خاں، جو فارسی و عربی کے مشہور شاعر اور نثار تھے اسی لئے نیاز نے بھی فارسی و عربی کی تکمیل کی اور ایف اے تک انگریزی پڑھی۔ ۱۹۲۳ء میں رسالہ ''نگار'' جاری کیا جو اب تک کراچی سے نکل رہا ہے۔

نیاز فتح پوری کا شمار ملک کے ان انشا پردازوں میں ہوتا ہے جنہوں نے نثر میں شاعرانہ رنگینیاں دکھائیں۔ ان کی تحریر میں شوخی، رعنائی، زورِ قلم اور نزاکت خیالی ہے جن کے باعث وہ دلکش اور مؤثر بن جاتی ہے۔ ان کے افسانے ''حمرا کا گلاب''، ''کیوپڈ اور سائکی'' میں حسن تخیل اور تخیل کی دلکش مثالیں ملتی ہیں۔ نیاز کی معرکہ آرا کتاب ''شہاب کی سرگزشت'' ہے جو حقیقی معنی میں معجزۂ ادب اور اپنے تخیل کی نزاکت میں لاثانی ہے۔ نیاز کے مضامین بھی ادب لطیف کا خزانہ ہیں۔ اور ان کی تنقیدیں بے مثل ہوتی ہیں۔ ادب۔ ''تمام فنون میں لٹریچر کی وہی حیثیت ہے جو گلدستہ میں چوٹی کے درمیان پھول کو حاصل ہے، بلکہ اس سے بھی زیادہ صحیح و لطیف انداز بیان میں یوں سمجھنا چاہئے کہ جس طرح ہم کسی پھول کو دیکھے بغیر محض اس کی خوشبو سے اس کی نوعیت کا اندازہ کر لیتے ہیں۔ اسی طرح ہم ایک قوم کے لٹریچر کو دیکھ کر اس کی حیات اجتماعی کے تمام پہلوؤں کو سمجھ سکتے ہیں۔''

اصولِ تنقید: ''ناقد کا کام ہے کہ ہر تصنیف کو منصفانہ نگاہ سے دیکھے اور اس کے محاسن و معائب پر انصاف سے قلم اٹھائے اور سوائے اظہار حقیقت کے کوئی اور غرض اس کے پیش نظر نہ ہو۔ اس لئے بہترین نقاد وہی ہوسکتا ہے جو کسی خاص فن یا موضوع سے گہری دلچسپی نہ رکھتا ہو، بلکہ عام علمی مذاق رکھتا ہو۔ غرض ایک آزاد نقاد کے لئے بہترین طریقہ یہی ہوگا کہ وہ اپنی قوتِ تمیز سے کام لے کر حسن و قبح کا فیصلہ کرے'' (انتقادیات) **رقاصہ** ''وہ ترالحنِ گلوسوز، وہ ساز میں ڈوبی ہوئی آواز، ایسی ڈوبی ہوئی کہ یہ معلوم ہی نہیں ہوسکتا کہ تیری آواز صدائے ساز ہے یا صدائے ساز تیری آواز ہے۔ ہنگامِ رقص وہ تیری شوخ و متحرک چتون جن کے نظامِ حرکت سے اصول ریاضی منضبط ہوسکتے ہیں، وہ پھڑکنے والی ابروئیں جن کی نازک لرزش سے ایک مصوّر کا قلم اپنی رفتار درست کرسکتا ہے۔ وہ آنکھیں جن کی گہرائی میں سمندر کا عمق ڈوب سکتا ہے۔ وہ نگاہیں جن کے بسط میں فضا کی وسعتِ گم ہوسکتی ہے۔ وہ کمر کا لوچ جو دنیا کو رعشہ براندام کرسکتا ہے۔ وہ گردن کی جنبش جو دنیا کی نیندوں میں تھرتھری پیدا کرسکتی ہے۔ اور وہ چرائے ہوئے بدن، پچھی ہوئی گردن، بل کھائی ہوئی کمر، لجاجت آلود نگاہ، شرم آگیں چتون سے ادا کرتی ہوئی، زیر نقاب چہرہ کو ایک طرف موڑ کر رقص کرتی چلی نہ جائے اور اپنی آنکھوں کی وہ شراب جو ابھی ابھی تیری لانبی سیاہ پلکوں کی آغوش میں پڑی چھلک رہی تھی مجھے نہ پلا دے۔'' (نگارستان ۱۹۱۳ء) **قلوپطرہ۔** ''میں چاہتا تھا کہ کسی طرح قلوپطرہ کی وہ نگاہیں دیکھوں جن سے مسحور ہوکر انسان خوشی سے جام زہر پی جایا کرتا تھا۔ یہ بت قلوپطرہ کا تھا۔ بلند و بالا، پرشباب، آشفتہ گیسو اور سر سے پاؤں تک بالکل عریاں و بے پردہ۔ میں حیران تھا کہ اگر قلوپطرہ کو پتھر بنا کر مبتلائے عذاب کیا گیا ہے تو اس کو خدا کے جمالیاتی ذوق کی رعایت کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ دفعتاً وہ بت شق ہوا اور اس کے اندر سے ایک عورت اسی شکل و صورت اور خد و خال کی نمودار ہوئی۔ اس کے تمام جسم پر چھوٹے چھوٹے آبلے موتی کی طرح جھلک رہے تھے۔ لبوں سے خون کے قطرے اور آنکھوں سے عنابی رنگ آنسو ڈھلک ڈھلک کر آبلوں پر رنگین خط ڈالتے ہوئے نیچے گر رہے تھے۔ گلے میں سفید انگاروں کا ایک ہار پڑا ہوا آگ کی لپٹ سے جنبش میں آ آ کر جسم سے مس کرتا تھا اور ہر بار اس کے گورے گورے جسم پر ایک سرخ نشان چھوڑ جاتا تھا۔ اس عالم میں بھی اس پر ایک شاہانہ جمال کا رنگ پیدا تھا۔ قیصر اور انطونی اگر اس حال میں بھی اسے دیکھ لیتے تو شاید اس سے دوبارہ مل جانے کے گناہ میں ایک عمر دوزخ میں بسر کرنے کے لئے آمادہ ہوسکتے تھے۔'' (جمالستان) (۱۹۲۴ء) **تصویر بتمید۔** ''ہلکی شفقی روشنی ہے۔ کرۂ زمین تاریک ہے۔ فضا میں صرف ایک ستارہ جھلملا رہا ہے۔ ایک لڑکی جس کی آنکھوں پر پٹی ہے اور ہاتھ میں بربط، سارے کرہ پر چھائی ہے۔ بربط کے تمام تار ٹوٹ چکے ہیں مگر ایک جس میں وہ برابر لرزش پیدا کر رہی ہے۔'' نیاز الفاظ کے تھے کھیلنے کے ماہر تھے ان کی انشا پردازی کسی حد تک شعر سے میل کھاتی تھی۔



قاضی عبدالغفار

(۱۸۸۸-۱۹۵۶ء)

قاضی صاحب کی پیدائش ۱۸۸۸ء مراد آباد میں ہوئی۔ علی گڑھ میں تعلیم حاصل کی اور وہیں ۱۹۵۶ء میں وفات پائی۔ مولانا محمد علی کے مشہور اردو اخبار ''ہمدرد'' دہلی میں بحیثیت نائب مدیر کام کیا۔ ان کے علمی وادبی مذاق پر دو شخصیتوں کی صحبت کا بہت زیادہ اثر ہوا۔ ایک مولانا محمد علی اور دوسرے حکیم اجمل خاں۔ قاضی صاحب نے انشا پردازی کا پرکیف شگفتہ اسلوب اور ذوق سلیم پایا تھا۔ ان کی تصانیف میں ''لیلیٰ کے خطوط'' کو خاص شہرت حاصل ہے۔ ''لیلیٰ کے خطوط'' میں حسن وعشق اور عقل ودل کے جذبے اور معرکے جس کمال کے ساتھ بیان کئے ہیں وہ اردو میں منفرد چیز ہے۔ ''لیلیٰ کے خطوط'' جدّتِ طبع، نفسیاتی تجزیہ اور انشا پردازی کا اعلیٰ نمونہ ہیں اور یہی اس تصنیف کی مقبولیت کا اصل راز ہے اور اسی لئے یہ کتاب دنیائے اردو میں وقعت کی نظر سے دیکھی جاتی ہے۔ فی الحقیقت اردو ادب میں یہ ایک حسین اور شاندار اضافہ ہے۔ سجاد حیدر یلدرم۔ ''محبت کا ایک قرضہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ یہ جانتے ہوئے کہ وہ ادا نہیں ہو سکتا۔ بیتے ہوئے زمانے کو جگا رہا ہوں۔ یہ جان کر کہ وہ زمانہ واپس نہیں آسکتا۔ محفل دیشب کے ٹوٹے ہوئے جام و مینا کے ٹکڑے سمیٹ رہا ہوں۔ اس یقین کے ساتھ کہ وہ اب میری دسترس سے باہر ہیں۔ یلدرم نے جو ادبی میراث اپنے ہم زبانوں کے لئے چھوڑی، وہ کچھ کم نہیں۔ ان قطروں میں ایک سمندر، ان چند دانوں میں دہقان کی آرزو کے تمام حاصلات، اس ایک آہ میں غم کی ساری دنیا اور اس ایک تبسم میں گلبانگ حیات کی تمام موسیقی، یہ سب وہ اپنے چند اوراق میں ہمارے لئے چھوڑ گئے۔'' لیلیٰ طوائف۔ ''تم۔ ایک ویرانہ میں آبادی ڈھونڈتے ہو، ایک ریگستان میں مرغزار چاہتے ہو۔ یہ کچھ بھی تمہیں نہیں مل سکتا۔ البتہ تمہارے پہلو میں ایک حسین چہرہ آسکتا ہے۔ تمہارے شانوں پر معطر بال بکھر سکتے ہیں۔ مگر۔ مگر اس سے زیادہ کچھ نہ مانگو، کچھ نہ چاہو۔'' ''جام میں چاہے شراب بھر دو، چاہے زمزم۔ مردوں نے جیسا چاہا عورت کو بنا دیا۔ ہیرے کی چمک تم نے چھین لی اور جو سنگ ریزہ بچا اس کو مٹی میں ملا دیا۔ موتی کی آب تم اڑا لے گئے اور باقی جو کچھ رہا اس کو ہوا میں اڑا دیا۔'' ''آفتاب کی ایک شعاع اور ماہتاب کی ایک کرن، تم چاہو کہ اپنی ساری دولت دے کر خرید لو تو نہیں خرید سکتے۔ عورت کے قلب کی گرمی اور روشنی اس سے بھی زیادہ گراں ہے۔'' ''عورت کے آنسو بھی مرد کے لئے ایک کیفیت رکھتے ہیں۔ عورت کو کبھی کبھی رونا بھی چاہئے کہ آنسوؤں کی جھڑی حسن میں ایک اور جھلک پیدا کرتی ہے۔'' ''خوشنوا اور خوبصورت پرند جن کو جنگلوں اور باغوں کی زینت بنایا گیا تھا، پنجروں میں بند کئے گئے، ان کے نغمے آزاد نہ رہے۔ ان کے پروں کی طاقت سلب کرلی گئی اور یہی حال عورت کا ہوا''۔ ''عورت بغیر آنسوؤں کے روتی ہے اور بغیر آواز کے چیختی ہے۔ آنکھیں بند کئے رکھتی ہے، وہ دیکھتی ہے مگر زبان نہیں کھولتی اور صبر کرتی ہے۔'' ''عورت کی زندگی اس لئے تلخ ہوتی ہے کہ وہ بھول نہیں سکتی۔ مرد اسی لئے زیادہ مطمئن اور بے پروا ہوتا ہے کہ رات کی بات صبح کو بآسانی بھول جاتا ہے۔ درحقیقت مرد فطرتاً خانہ بدوش ہے اور عورت وطن پرست۔ مرد ہر جگہ اپنا گھر بنا لیتا ہے، ہر جگہ اپنا دل لگا لیتا ہے اور عورت جس دیوار کے سائے میں بیٹھ جاتی ہے، پھر اٹھ نہیں سکتی۔ وہیں سے اس کا جنازہ اٹھتا ہے اور بعد میں اس جنازہ پر کمخواب و دیبا کی چادریں ڈال دی جاتی ہیں۔'' ''بیمار، تم نے دیکھے ہی نہیں۔ جب نیزہ کی انی دل کے پار ہو جائے، جب تلوار کی دھار روح کے اندر بیٹھ جائے، جب زہر کا بجھا ہوا ایک تیر جسم کے اندر، جان میں پیوست ہو اور ہر وقت کھٹکتا ہو! جب سمجھو تم بیمار ہو۔ تمہیں تو یہ بھی معلوم نہیں کہ حسرت وارمان کی اس دنیا میں مرنے والے، تڑپنے والے اور بیمار ہی در اصل جیتے ہیں۔ تم کہو گے میرا اتار چڑھاؤ بھی عجیب ہے۔ کبھی بجلی بن کر چمکتی ہوں، کبھی بادل بن کر گرجتی ہوں کبھی برستی ہوں تو برسے چلی جاتی ہوں کبھی آندھی کی طرح اٹھتی ہوں تو چڑھے چلی جاتی ہوں۔ کبھی پھول کی طرح مسکراتی ہوں اور کبھی شبنم کی طرح آنسو بن جاتی ہوں۔ ابھی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی ہیں تو ابھی گرمیوں کی لو چلنے لگی۔'' ''کس نے مجھے بنا دیا؟ کیوں میں ایسی بن گئی''؟ (لیلیٰ کے خطوط ۱۹۳۲ء)



اِمداد امام اثرؔ

(۱۸۴۹-۱۹۳۴ء)

آپ ۱۸۴۹ء میں پیدا ہوئے۔ زندگی کا بیشتر حصہ پٹنہ میں گزارا۔ اثرؔ فارسی واُردو میں فاضل اور زبان انگریزی میں خاص مہارت رکھتے تھے۔ اِن کی معرکہ آرا تصنیف ''کاشف الحقائق'' کی بدولت ان کا نام آج بھی زندہ ہے۔ اس میں دُنیا کی تمام مشہور زبانوں کی شاعری پر عالمانہ اور محققانہ بحث کی گئی ہے۔ اثرؔ شاعری کے حکیم تھے۔ اُنہوں نے ''کاشف الحقائق'' میں شعراء پر جو تنقید کی ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اثرؔ بلند پایہ مُصنّف، جادُو اثر ادیب اور بالغ نظر نقاد تھے۔ ۱۹۳۴ء میں انتقال ہوا۔ عرب کی شاعری (فرزدقؔ کا مشہور فی البدیہہ قصیدہ) اُموی خلیفہ ہشام بن عبدالملک، حج کے لئے شام سے مکہ معظمہ آیا۔ وقتِ طواف جب اُس نے چاہا کہ حجرِ اسود کو بوسہ دے تو اژدہام مردُم سے اُسے اس کا موقع نہ ملا۔ لیکن جب امام زین العابدینؑ (بن حضرت امام حُسین علیہ السلام) طواف کے لئے تشریف لائے تو لوگ غایتِ ادب سے دورَویہ ہوگئے۔ آپ نے حجرِ اسود کو بوسہ دیا۔ ہشام نے خلائق کا یہ عالم دیکھا تو تجاہل عارفانہ سے پوچھا کہ ''یہ صاحبِ جاہ وجلال جس کی زائرینِ کعبہ نے اِس قدر تعظیم کی، کون ہے''؟ گو ہشام جانتا تھا کہ (یہ یادگار وجانشینِ پیغمبر ہیں) اتفاقاً عرب کا مشہور شاعر فرزدقؔ موجود تھا، اُس نے فی البدیہہ یہ فصیح وبلیغ قصیدہ پڑھا۔ ہشام نے فرزدقؔ کو قید کرلیا۔ ترجمہ۔ ''یہ وہ شخص ہے کہ مکہ اُس کے جائے قدم کو پہچانتا ہے اور خانہ کعبہ اِس کو جانتا ہے اور حل وحَرم بھی اُسے پہچانتے ہیں'' یعنی اے ہشام تو اگر اِس شخص کو نہیں پہچانتا ہے تو کیا، اس شخص کے موضع قدم کو خانہ کعبہ اور حل وحَرم پہچانتے ہیں۔'''' یہ بیٹا بہترین بندگانِ خدا کا ہے۔ یہ پرہیزگار، پاکیزہ، پاک، سردارِ گروہ ہے'' (بہترین بندگانِ خدا سے مُراد رسول اللہ ﷺ اور سردارِ گروہ سے قریش مُراد ہے) ''جب وہ اُسے بوسہ دینے کے لئے آتا ہے تو سنگِ اسود اُس کے ہاتھ کو پکڑنے کیلئے قریب آنا چاہتا ہے۔'' یعنی (سنگِ اسود یہ جان کر کہ وہ فرزندِ رسولؐ ہے اُسے پکڑ لینا چاہتا ہے) ''نورِ ہدایت اِس کے نورِ پیشانی سے اِس طرح نکلتا ہے جیسا کہ آفتاب۔ کہ اِس کی رخشانی سے تاریکیاں زائل ہوجاتی ہیں'''' یہ پسرِ فاطمہؑ ہے۔ جان لے اگر تجھ کو نہیں معلوم ہے اِس کا نانا خاتم النبیینؐ ہے'''' پس تیرا یہ کہنا کہ یہ کون ہے۔ ممدوح کی ضرر رساں نہیں ہوسکتا۔ تُو نے جسے نہیں پہچانا اُسے عرب وعجم پہچانتے ہیں'' (کاشف الحقائق ۱۸۹۷ء) اُردو شاعری۔ ''غالبؔ کا یہ فرمانا کہ ہم میرؔ کے رنگ میں دَر آئے واقعات سے بہت بعید نہیں۔ واقعی جو سوز وگداز، خستگی، درد، برشتگی، نشتریت، بلند پردازی، نازک خیالی، تمکنت، جلالت، تہذیب، شوخی، غالبؔ کے کلام میں ہے، باستثنائے دردؔ ومیرؔ کسی اُستاد کے کلام میں نہیں پائی جاتی۔ نشتریت تو ایسے غضب کی ہے کہ میرؔ کے کلام میں بھی اس سے زیادہ نہ ہوگی۔ پُر تاثیری کا کیا کہنا'' دردؔ اور کسک میں، سوز وگداز میں دردؔ کی غزلیں، میرؔ کی غزلوں کے دوش بدوش ہیں۔ فرق یہ ہے کہ میرؔ اکے یہاں ایک خستگی اور کھلی ہوئی سپردگی ہے اور دردؔ اپنے کو لئے ہوئے ہیں'' ''ہر چند وہ (سوداؔ) اِس صنفِ شاعری (غزل) میں میرؔ کے برابر نہیں ہیں، اِس پر بھی وہ اِس صنفِ شاعری کے بھی ایک بڑے اُستاد ہیں۔ اُن کا کلام درد، سوز وگداز، خستگی سے خالی نہیں اور یہ وہ صفتیں ہیں جو غزل سرائی کی جان ہیں'''' میر حسنؔ کی مثنوی ایک نہایت حیرت انگیز تصنیف ہے۔ اس مثنوی میں شاعری کا خاتمہ نظر آتا ہے۔ فارسی اور اُردو کے کسی مثنوی نگار نے میر حسنؔ کے برابر فطرت نگاری کا رنگ نہیں دیکھایا۔ حقیقت یہ ہے کہ جس شخص نے اِس مثنوی کو حکیم کی نگاہ سے نہ دیکھا، اُس نے گویا شاعری کا لُطف ہی نہیں اٹھایا'' ناسخؔ کی غزلیں واردات وجذباتِ قلبیہ ودیگر امورِ ذہنیہ کے مضامین سے معرّا ہیں (کاشف الحقائق ۱۸۹۷ء)



ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری

(۱۸۸۷-۱۹۱۹ء)

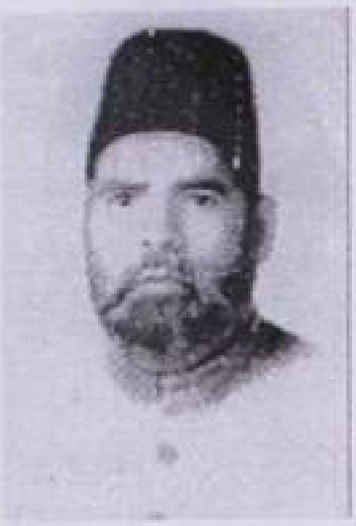
بجنوری کی پیدائش ۱۸۸۷ء میں بمقام بجنور ہوئی تھی۔ یہ پہلے ادیب ہیں جنہوں نے اُردو میں انگریزی طرز کی فاضلانہ محاسن نگاری کی بنیاد ڈالی۔ وہ نقادِ سخن کی حیثیت سے بڑے بلند مقام پر فائز ہیں۔ زبان دانی سے اُنہیں خاص مناسبت تھی انہوں نے قیامِ یورپ میں وہاں کے مشہور شعراء کے کلام کا مطالعہ کیا تھا۔ اس سے اُن کی باریک بینی اور نکتہ رَس نگاہ میں بہت وُسعت پیدا ہوگئی تھی۔ ڈاکٹر بجنوری کا اصلی کارنامہ مرزا غالب کی شاعری پر ایک بسیط تبصرہ ہے جو "محاسن کلام غالب" کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں اُنہوں نے غالب کا مقابلہ شعرائے یورپ سے کیا اور دکھایا کہ فقط اُردو زبان ہی میں نہیں، بلکہ ساری دُنیا کی "بزمِ ادب" میں دہلی کے اِس خاک نشین کی شاعری کا کیا رُتبہ ہے۔ اُنہوں نے غالب کے کلام پر مختلف پہلوؤں سے نہایت عمیق نظر ڈالی ہے۔ مرحوم کا تخیل خود اپنا بلند پرواز واقع ہوا تھا کہ غالب کے اشعار میں جن باریکیوں تک اُن کی نظر پہنچی، دوسروں کی اب تک نہیں پہنچی تھی۔ افسوس وہ حقائق شناس جس نے سب سے پہلے غالب کی فلسفیانہ گتھیاں سلجھائیں، ۱۹۱۹ء میں عین عالمِ شباب میں، ابدی نیند سوگیا۔ "غالب نے بزمِ ہستی میں جو فانوسِ خیال روشن کیا ہے، کونسا پیکرِ تصویر ہے جو اس کے "کاغذی پیرہن" پر منازلِ زیست طے کرتا ہوا نظر نہیں آتا۔ کونسا نغمہ ہے جو اس سازِ زندگی کے تاروں میں بیدار یا خوابیدہ موجود نہیں" "شاعری انکشافِ حیات ہے۔ جس طرح زندگی اپنی نمود میں محدود نہیں، شاعری بھی اپنے اظہار میں لاتعین ہے" "مرزا غالب کے لئے شاعری مُوسیقی اور مُوسیقی شاعری ہے۔ یہی باعث ہے کہ دیوان کا ہر مصرعہ تارِ رباب نظر آتا ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ شاعری مُصوّری ہے۔ اس پہلو سے بھی "دیوانِ غالب" عدیم المثال ہے۔ اس کے ہر ورق پر ایسے اشعار موجود ہیں جن کو "صفحۂ قرطاس" سے "جامۂ تصویر" پر منتقل کیا جاسکتا ہے۔ حُسن وعشق کے تمام معاملات کو مرزا نے اِس خُوبی سے نظم کیا ہے کہ ہو بہو تصویر نگاہوں میں پھر جاتی ہے۔ اس کے لئے صرف زبان پر قُدرت ہونا کافی نہیں۔ بلکہ فطرت کا بڑا نکتہ داں ہونا ضروری ہے۔" "مرزا غالب کی چشمِ بینا قُدرت کو نقاد نگاہ سے دیکھتی ہے اور ہر نظر میں ایک نیا جلوہ پاتی ہے۔

شمع بجھتی ہے تو اُس میں سے دُھواں اٹھتا ہے	شعلۂ عشق سیاہ پوش ہوا میرے بعد
نیند اُس کی ہے، دماغ اُس کا ہے، راتیں اُسکی ہیں	تیری زُلفیں جس کے شانے پر پریشاں ہوگئیں

"اگر وہ مُرقع ساز جو عشق ومحبت کے معاملات کے نئے نئے مضامین کے مُتلاشی رہتے ہیں، غالب کے اشعار کو لوحِ قرطاس سے پارۂ تصویر پر مُنتقل کریں تو اُن میں سے ہر ایک، ایک "یادگار زمانہ[۱] تصویر ہو" "غالب کا دِل ایک آئینہ ہے جس میں مظہرِ الٰہی اور منظرِ قدرت کا جلوہ موجود ہے اور غالب کی زبان ترجمانِ حقیقت ہے۔ اس کے کارِ تخیل کا دائرۂ امکان سے ہمکنار ہے۔ عالمِ کون وفساد میں ایک ذرّہ کی جنبش بھی اس کے حلقۂ عود سے باہر نہیں ہے۔ غالب ایک فلسفی ہے جو شاعری کا جامۂ زیبِ تن کئے ہوئے ہے۔" "عشق کیا ہے، عشق میں ادب اور شرم شامل ہیں۔ عشق دُور سے پرستش اور پرستاری کرتا ہے، جہاں اضطراب، آتشِ زیرپائی یا خوف ہے، وہاں عشق نہیں۔ عشق نُور ہے اور جلوت خلوت دونوں کو اپنی ضیاء سے روشن کرتا ہے" "غالب کی فصاحت کی یہ کیفیت ہے کہ گویا دریائے لطافت رواں ہے۔ غرض مرزا کے کلام کی عجیب سادگی اور ہوشیاری اور عجیب تر بے خُودی اور پُرکاری انتہائے کمال ہے۔" (محاسن کلام غالب ۱۹۲۱ء)

---

[۱] عبدالرحمٰن چغتائی کا اُردو ادب پر بہت بڑا احسان ہے کہ اُنہوں نے "مُرقع چغتائی" میں غالب کے اشعار کو مُصوّر کیا۔ یقیناً ان کی یہ تصویریں یادگار زمانہ رہیں گی۔ (مرتب)



مولانا احسنؔ مارہروی

(۱۸۷۶ـ۱۹۴۰ء)

مولانا، حافظ، شاہ، سید علی احسن بلگرامی تخلص احسنؔ مارہروی کے والد ماجد الحاج سید مجتبیٰ حسن بلگرامی زیدی، سجادہ نشین سرکار خورد مارہرہ جو صاحب تقویٰ بزرگ تھے۔ آپ کی علمیت اور تبحر علمی کے متعلق اس دور کے اہل کمال شاہد تھے۔ وہی صفت اور خصوصیت احسنؔ مارہروی کے حصے میں آئی تھی۔ شاہ سید مجتبیٰ حسن بلگرامی اُردو فارسی و عربی کے عمدہ شاعروں میں شمار کیے جاتے تھے۔ آپ حج و زیارت عتبات عالیہ کی خاطر اپنے اہل و عیال کے ہمراہ مکہ (۱۳۱۰ھ) میں تشریف لے گئے تھے۔ زیارتِ عراق کے بعد آپ اپنی اہلیہ احتشام فاطمہ اور بیٹے علی احسن کے ہمراہ بغرض حج مکہ مکرمہ گئے۔ ارکانِ حج کی ادائیگی کے بعد مکہ مکرمہ میں سیدہ احتشام فاطمہ بنت سید ابن امام بلگرامی نے چندروز علیل رہ کر قضا کیا اور جنت معلّٰی مکہ مکرمہ میں مقامِ آخر پایا۔ جو بڑے شرف کی بات ہے یوں کہ خاندانِ ہاشمی اور مطلبی کے جملہ افراد اسی مقامِ خاص میں آسودہ ہیں۔ حضرت عبدالمطلب، حضرت ابوطالب، حضرت خدیجۃ الکبریٰ زوجہ اوّل رسول مقبول صلی اللہ علیہ آلہ وسلم وغیرہ کی یہی آخری آماجگاہ ہے۔

حاجی سید مجتبیٰ حسن بلگرامی اپنے بیٹے سید علی احسن بلگرامی کے ہمراہ وطن واپس تشریف لائے، مگر بمبئی میں ہی آپ کی طبیعت ناساز ہوئی اور چندروز بعد آپ نے بھی رحلت فرمائی۔ بمبئی ہی میں آپ کی تدفین کردی گئی۔ اس حادثہ جانکاہ کا علی احسن پر بے حد اثر ہوا۔ مگر اپنے پر قابو کر کے اور صبر فرما کر مارہرہ تشریف لائے۔ جہاں چندروز بعد رواجِ خاندان کے مطابق آپ کی سجادہ نشینی و خرقہ پوشی عمل میں آئی۔ اور باپ کی وراثت یعنی سجادہ نشینی نصیب ہوئی۔ اگر چہ بعد میں آپ نے اس منصب داری سے واسطہ نہیں رکھا اور نہ ہی آپ کی اولادوں نے اس سے تعلق رکھا۔

خاندانِ بلگرام کے دستور کے مطابق احسن مارہروی نے ابتدائی تعلیم تو خانقاہ برکاتیہ کے مکتب میں حافظ عبدالکریم اور میاں جی رحمت اللہ سے حاصل کی۔ اور قرآن پاک کے حفظ کے بعد فارسی، عربی اور اُردو کی تعلیم کے حصول میں لگ گئے۔ انگریزی کی تعلیم کی سمت بھی آپ کو رغبت تھی مگر والد بزرگوار نے مناسب اور گوارہ نہیں خیال کیا پھر بھی آپ اپنے طور پر تحصیل علم انگریزی کرتے رہے۔

احسن مارہروی طبعاً خوش گو، خوش مزاج، باوضع، سنجیدہ، متعین اور باوقار شخصیت کے فرد تھے۔ متواضع اور مہمان نواز، یہ صفت آپ کو خاندان سے ورثہ ملی تھی۔ جو علامہ سید عبدالجلیل بلگرامی (۹۲۷ھ ولادت) اور شاہ حضرت برکت اللہ پیمی تخلص (۱۰۷۰ھ رحلت) اور شاہ سید آل احمد بلگرامی (۱۱۱۱ھ ولادت) اور شاہ سید محمد حقانی (۱۲۱۰ھ وفات) کے علمی صفات اور علمی محرکات پر مبنی ہے۔ موصوف کے علمی کارنامے طویل ہیں۔ ان میں سے چند تالیف درج کی جاتی ہیں۔

(۱) کلّیاتِ ولی (تدوین و مقدمہ)، (۲) منشورات جو دراصل تاریخ اُردو عہد بہ عہد، زبان و مثال زبان کی ترقی پر اوّل بار دنیائے اُردو میں تحریر کی گئی۔ اس سے نثر اُردو کی تاریخ وار منزل کی آگہی ہوجاتی ہے۔ (۳) جلوۂ داغ۔ سوانح مرزا داغ، یہ احسن مارہروی کی تصنیف اوّل ہے جس سے آپ کی نثری صلاحیت اُجاگر ہوتی ہے۔ (۴) یادگارِ داغ، مجموعہ کلام مرزا داغ، (۵) انشائے داغ، مجموعہ مکاتیب داغ، (۶) منتخب داغ، چار دواوین کو حسن کلام کے اعتبار سے مرتب کیا گیا ہے۔ گلزارِ داغ ۔ اور مہتاب داغ ۔ اس سے احسن مارہروی کے نقد و ترتیب و تدوین کی آگاہی ہوتی ہے۔ (۷) فصیح اللغات۔ امیر اللغات اور فرہنگ آصفیہ کے طرز کو مدنظر رکھ کر مرتب کیا گیا۔ خود احسن

مارہروی عرصہ دراز تک شعبہ اُردو مسلم یونیورسٹی کے اساتذہ میں شریک رہے۔ ۱۹۴۰ء میں آپ نے رحلت فرمائی۔ مدفن خانقاہ برکاتیہ مارہرہ شریف قرار پایا۔

موصوف کی قادر الکلامی اور فن پر ایک نامور محقق پروفیسر رشید احمد صدیقی کے مضمون کا یہ تراشہ ملاحظہ ہو:

"......رحلت کے وقت مرحوم کا سن چھیاسٹھ کے لگ بھگ رہا ہوگا۔ جسم کے بھاری بھر کم تھے۔ سوسائٹی میں اپنی خوش دلی اور شرافت خیالی و مقالی سے مقبول اور ادبی مسائل کو منقح کرنے کے بہت دلدادہ تھے۔ جو بات نہ معلوم ہوتی وہ دوسروں سے پوچھ لیتے۔ خواہ وہ ان سے کتنا ہی چھوٹا ہو۔ مطلق تامل نہ کرتے۔ اکثر دیکھا کہ بیٹھے ہوئے ہیں، باتوں میں کوئی لفظ یا محاورہ ایسا آگیا جس کی صحت یا محل استعمال پر اختلاف آ رہا ہوا۔ فوراً اس کی ٹوہ میں لگ گئے۔ یہ محسوس ہوتا ہے کہ کھوئے کھوئے سے ہیں۔ بار بار حوالے کی کتابوں کی ورق گردانی کرتے۔ مطلب برآری نہ ہوتی تو بلا کسی تامل کے، سب کو چھوڑ کر لائبریری چلے جاتے۔ وہاں بھی کام نہ چلتا تو کئی کئی دن اسی ادھیڑ بن میں رہتے۔ آخر بات واضح ہو جاتی تو خوش خوش آن کر اُس دن کی صحبت میں بیٹھنے والوں کو فرداً فرداً تحقیقات کے نتائج بتاتے۔" (گنج ہائے گراں مایہ، صفحہ ۱۶۷)

شعری نثری کارناموں کے سوا، صحافت کے سلسلے میں ماہنامہ "ریاض سخن" سے اس کی ابتدا کی تھی۔ جو مارہرہ شریف سے نکالنا طے کیا تھا۔ یہی نہیں، اپنے استاد داغ دہلوی کی وفات کے بعد ان کے نام اور کلام کو زندہ رکھنے کی خاطر موصوف نے "فصیح الملک" کے نام سے لاہور سے ایک رسالے کی طرح بھی ڈالی تھی۔ جس کی مدتِ حیات پانچ سال تین ماہ رہی، اس کے بعد حالات کے اقتضا نے اُسے ملتوی کرا دیا۔

احسن مارہروی کی غیر مطبوعہ غزل کے چند اشعار

تو اب جب ہم نے تجھے اشک قمر دیکھ لیا ڈال کر پردۂ شب روئے سحر دیکھ لیا
دل کے آنے کو نہ کیوں جان کا جانا سمجھو در اُلفت جو کھلا موت نے گھر دیکھ لیا
مل گئی داد غمِ عشق کی احسن اُس نے سن لیا قصۂ دل زخم جگر دیکھ لیا

مجھے خبر نہیں غم کیا ہے اور خوشی کیا ہے یہ زندگی کی ہے صورت تو زندگی کیا ہے
تمام عمر اسی رنج میں تمام ہوئی کبھی یہ تم نہ پوچھا تیری خوشی کیا ہے
ازل میں قادرِ مطلق نے دے کے حکمِ سجدہ بتا دیا یہ فرشتوں کو آدمی کیا ہے
وہ رات دن نہیں ملتے تو ضد نہ کر احسن کبھی کبھی کی ملاقات بھی بری کیا ہے

رثائی اور حزنیہ و غم زدہ کلام۔ نوحہ و سلام اور مرثیہ کے ضمن میں "کارنامہ غم" بہ سلسلہ سید الشہداء حضرت امام حسینؑ بطور نذرانہ بھی خوب ہے۔ اب سے ۷۵ سال قبل ۱۳۵۷ھ کا یہ کلام مطبوعہ ہیں۔ نمونہ ملاحظہ۔

وہ آنکھ نہیں تر جو محرم میں نہیں وہ دل نہیں مغموم جو اس غم میں نہیں
سن کے غم شبیر نہ رونے والا ممکن ہے کہ ہو بشر، مگر ہم میں نہیں

....



رشید احمد صدیقی

(۱۸۹۶-۱۹۷۷ء)

پروفیسر رشید احمد صدیقی کی پیدائش ۱۸۹۶ء میں جونپور میں ہوئی تھی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد علی گڑھ سے فارسی میں ایم اے کرکے اُردو ادب کے پروفیسر ہو گئے۔ مُسلم یونیورسٹی میں تمام عمر گزار کر وہیں سے پنشن لی اور علی گڑھ کو اپنا وطن بنالیا۔ رشید احمد صدیقی طنز و مزاح میں ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ ان کے مضامین میں انفرادیت اور ایک مخصوص شان ہوتی ہے۔ رشید احمد صدیقی کے طرزِ تحریر کی ایک بڑی خوبی اس کی ادبی شان اور چُبھتے ہوئے فقرے ہیں۔ استعارے، کنائے، اور شاعرانہ نزاکت بیان کے نمونے بکثرت ملتے ہیں۔ آپ کی تصنیف "گنجہائے گرانمایہ" اُردو میں مُرقع نگاری کا ایک نادر نمونہ ہے۔ یلدرم "سجاد حیدر یلدرم کے ہاں حُسن و محبت کا کاروبار ہے اور مجاز کی طرفگی و تازگی ہے۔ اُن کی تحریروں میں ایک بات نہایت واضح طور پر ملتی ہے یعنی وہ جذبات کی رَو اور روانی میں بھی اپنے وزن اور وقار کو بہہ جانے نہیں دیتے۔" "مردِ غازی کے کارنامہ کا اندازہ مقبوضات کی وسعت، مالِ غنیمت کی فراوانی، جشن و جلوس کی ہماہمی و طرب انگیزی، تمغہ و اسلحہ کی چمک اور جھنکار سے نہیں کیا جاتا، بلکہ اس کا اندازہ کیا جاتا ہے، ٹوٹی ہوئی تلوار، بکھری ہوئی زرہ، بہتے ہوئے لُہو، اور دہکتی ہوئی رُوح اور دمکتے ہوئے چہرے...... ڈوبتے ہوئے سُورج سے" (گنجہائے گرانمایہ ۱۹۴۲ء) طنز اور ظرافت کی داغ بیل سب سے پہلے اُردو نثر میں غالب نے ڈالی اور یہ پیش خیمہ تھا "اودھ پنچ" کی زعفران زار نظم و نثر کا یہ کہنے میں تامّل نہیں ہوسکتا کہ جہاں تک "طنزیات" کا بحیثیتِ فن اور ادب کے تعلق ہے۔ "اودھ پنچ لکھنؤ" کے دَور سے قبل طنزئین کی مِثال نثر میں نہیں ملتی۔ اِس میں شک نہیں کہ "پنچ" ظرافت کا علمبردار تھا اور ظرافت کے اِس بے پناہ آلہ نے زندگی کے کسی شُعبہ کو اپنے وار سے محفوظ نہ رکھا۔ اُردو ادب میں "اودھ پنچ" اپنے قسم کا اوّلین پرچہ تھا اور اکثر حیثیت سے وہ ظرافت و طنزیات کے رائج الوقت معیار کا بہترین ترجمان تھا۔" (طنزیات و مضحکات ۱۹۳۵ء) "ڈاکٹر۔ میرے ایک دوست ہیں جن کا مقولہ ہے کہ آج کل کے ڈاکٹروں اور طریقۂ علاج سے سابقہ پڑ جائے تو جان و مال دونوں کا بس خدا ہی حافظ ہے۔ اوّل تو یہ لوگ مرض کے تشخیص کرنے میں اتنے روپے خرچ کرا دیتے ہیں کہ مریض قلاش ہو جاتا ہے۔ پھر مریض میں قدرے توانائی بھی ہونی چاہیے۔ ورنہ تشخیص کے سلسلے میں اکثر اس کو دَربدر پھرتے پھراتے ہی مار ڈالتے ہیں۔ اس کے بعد علاج کا دَور آتا ہے۔ اس میں قیمتی دوائیں مہنگے مقامات، جہاں اُسے جلاوطن کرتے ہیں اور تیمارداری کے وہ ضوابط ہیں جن کو برتنے کے بعد تیماردار خود مریض بن جاتا ہے۔ اِن سب سے عہدہ برآ ہونے کے بعد جب موت واقع ہوتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ گھر کا سارا اندوختہ ختم ہو چکا ہے اور ڈاکٹر کا بل ادا کرنا باقی ہے" "دیہاتی" "عورت کو مایۂ عزت سمجھتا ہے اور شہری آلۂ تفریح۔ دیہاتی کے نزدیک عورت کا مفہوم یہ ہے کہ وہ اس کا امکان ہے جہاں وہ ہنستا ہے بولتا ہے، آرام کرتا ہے، پناہ لیتا ہے اور کشاکشِ حیات سے عہدہ برآ ہونے کے لئے تازہ دم ہو کر نکلتا ہے۔ تعلیم یافتہ کے نزدیک عورت عضویاتی ضرورت ہے، یا ایک وسیلۂ تفنن، جس کیلئے اُس نے تفریحی مقامات تعمیر کئے۔ دیہاتی پناہ اور آرام چاہتا ہے۔ شہری صرف غم غلط کرنا چاہتا ہے۔ دیہاتی کے یہاں محنت، دیانت اور عورت ہے، شہری بھی عورت کا طالب ہوتا ہے لیکن محنت و دیانت سے نہیں بلکہ مکر و دولت سے۔ تفریح گاہوں کی تعمیر دولت اور مشین سے ہوتی ہے۔ یہ ایک لحظ میں تعمیر ہوتی ہیں اور اپنے تعمیر کرنے والوں کی دولت اور حُسن کی مانند ایک لحظہ میں فنا ہو جاتی ہیں۔ جھونپڑا نسلوں کی تعمیر ہے اور نسلوں کے فنا ہو جانے کے بعد بھی قائم رہتا ہے۔" (مضامین رشید) پروفیسر رشید احمد صدیقی نے ۱۹۷۷ء میں رحلت کی اور مسلم یونیورسٹی کے قبرستان میں مدفون ہوئے۔ آپ کی وفات کے بعد اردو دنیا نے ایک مزاح نگار کا اتنا غم منایا جو دوسروں کو نصیب نہیں ہوسکا۔



سید نصیر حُسین خیاؔل

(۱۸۸۰-۱۹۳۴ء)

سید نصیر حُسین خیال اپنے عہد کے نامور ادیب تھے۔ سیماب کا شعری تبصرہ پہلے پڑھیں۔

خاموش ہے کیوں مرثیہ خوانِ اُردو — تھا ختم ابھی کہاں بیانِ اُردو
نیند آگئی داستاں سُنانے والے — اب کس سے سُنیں گے داستانِ اُردو
(سیماب اکبر آبادی)

نواب نصیر حُسین خیال ۱۸۸۰ء میں عظیم آباد پٹنہ میں پیدا ہوئے خیاؔل بادشاہ گروں کے خاندان سے ہیں، ۱۹۲۰ء میں یورپ گئے۔ آپ نے۔ کیمبرج یونیورسٹی میں اُردو زبان پر تقریر کی۔ ۱۹۳۴ء میں انتقال ہوا۔ نواب خیاؔل، صاحب طرز ادیب تھے اور اُن کی تصنیف ''داستانِ اُردو'' انشاپردازی کا بہترین نمونہ ہے۔ اس میں عبارت کی دلآویزی اور اندازِ بیان کی سحر کاری ہے۔ اِسی سے اُن کو بقائے دوام حاصل ہوئی۔ خیاؔل کی زباندانی اور ادب کو دیکھ کر ''سرسید'' اور ''شرر'' جیسے مشہور ادیبوں نے تعریف کی تھی۔ خیاؔل کا طرزِ نگارش نرالا اور انوکھا ہے اور اُن کا ہر فقرہ بولتا ہوا جادو۔ نواب خیاؔل کی عبارت میں سادگی کے باوجود بلا کا بانکپن اور غضب کی شوخی ہے ''اُردوئے معلیٰ تیمور کے پوتے بابر کے پیار اور اخلاص کا حال گزر چکا۔ اب شاہجہاں کی حکایت بھی پڑھو۔ شاہجہاں کو زبانِ اُردو پر وہی حق دعویٰ ہے جو کسی صناع کو اپنی صنعت و کاریگری پر ہوا کرتا ہے۔ شاہجہاں اُردو کی گود میں پیدا ہوا اور اسی کے دامن میں پلا۔ اذان کے بعد جو پہلی آواز اس کے کانوں میں پڑی وہ اسی زبان (اُردو) کی صدائے خوش تھی (کیونکہ دادی اور ماں ہندو رانیاں تھیں) شہزادہ کی پیدائش پر جو جشن ہوا اور حرم سرا میں جو خوشیاں منائی گئیں وہ ''تُرکانہ'' نہ تھیں، بلکہ ''ہندووانہ'' تھیں۔ یہ پیدا ہوا تو ساری راجپوتی رسمیں برتی گئیں۔ زچہ خانہ تک گایا گیا۔ لوریاں، چھٹی چلّے کے گیتوں اور راگوں کی دھنیں اِسی زبان میں ہوئیں۔'' ''شاہجہان آباد (دہلی) بن چکا اور بادشاہ کے مُبارک قدم اِدھر آئے تو اُردوئے معلیٰ کا شیر خوار بھی دامن دولت سے لپٹا ہوا ساتھ ساتھ آیا۔ اُس دن یہ طفل ''لال قلعہ'' میں اور شاہجہاں کے سے سرپرست کی نظر کے سامنے پلنے اور بڑھنے لگا۔ شاہجہاں نے اس شیر خوار پر صرف زبانی مہر و شفقت نہیں دکھائی، بلکہ دِلی الفت سے اِسے گود میں لیا اور منہ سے منہ ملا کر ہمیشہ پیار کیا۔'' ''دِلی کی تین بیٹیاں فیض آباد اور لکھنؤ گئیں۔ پہلی صاحبزادی ''بہو بیگم'' تھیں جنہیں محمد شاہ، بادشاہ نے اپنی بیٹی بنایا، چھاتی پر سُلایا اور اپنے وزیر زادے ''نواب شجاع الدولہ'' والیٔ اودھ (لکھنؤ) بیاہ دیا۔ دوسری صاحبزادی یہ ''دُلہن بیگم'' تھیں جو دلی کے محلوں سے بڑے چاؤ اور ارمان کے ساتھ فیض آباد آئیں اور نواب آصف الدولہ (خلف نواب شجاع الدولہ سے بیاہی گئیں دلی کی تیسری بیٹی ہماری یہ اردو تھی جو لال قلعہ (دہلی میں پروان چڑھ کر آخر اودھ (لکھنؤ آئی) اور یوں آئی اور وہ ''دُلہن'' بنی۔ دُلہن بیگم اپنی زبان (اُردو) دہلی اور قلعۂ معلیٰ سے ساتھ لائیں۔ شاعری بھی جہیز کی طرح دامنِ دولت سے لپٹی اُن کے ہمراہ اودھ گئی۔'' (انگریزوں نے پہلے فارسی کو ختم کیا۔ پھر اُردو کو نکال کر انگریزی کو دفتری زبان بنایا۔ اِن واقعات کو خیال اس طرح ظاہر کرتے ہیں) ''اب مُغلوں کی دفتری زبان ''فارسی'' کا گلا گھونٹ دینا کیا مشکل تھا مگر دانا جلد باز نہیں ہوتا۔ مچھلی زور سے پھنسائی نہیں جاتی۔ تجربہ کار دریا میں اپنی ڈور اور چارا چھوڑ کر بیٹھ جاتا اور سانس نہیں لیتا کہ مچھلی نے چارا کھایا اور بھاگی۔ مچھلی سمجھی کہ لے اُڑی، مگر دانا شکاری اُس وقت زور نہیں کرتا بلکہ ڈھیل دیتا ہے۔ مچھلی کے منہ میں ڈور کا کانٹا ہے، جائیگی کہاں؟ وہ پانی میں دَوڑی، دُھوپی، آخر تھکی، گری اور مزے میں پکڑی گئی۔ سیاست کا جال بھی یونہی بچھایا جاتا ہے اور غریب مچھلیوں کو پہلے چارا دے کر تھکایا جاتا، پھر نکال کر ان کا چھلکا اُدھیڑا جاتا ہے۔'' (داستانِ اُردو ۱۹۳۲ء)

(۴۴)



مولانا حامد حسن قادری

(۱۸۹۷ء۔۱۹۶۴ء)

قادری صاحب کی پیدائش ۱۸۹۷ء کی ہے۔ رام پور میں تعلیم حاصل کر کے سینٹ جانس کالج، آگرہ میں صدر شعبۂ فارسی و اُردو رہے۔ اور ۱۹۵۲ء میں ریٹائر ہو کر کراچی میں سکونت اختیار کی۔ آپ کا ۱۹۶۴ء میں انتقال ہوا۔ حامد حسن قادری ادیب، اِنشا پرداز اور نقاد تھے۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ "داستان تاریخ اُردو" ہے۔ جو نثر نگاروں کی سب سے مکمل، مستند اور جامع تاریخ ہے اِس کے دیباچہ میں لکھتے ہیں "کسی مُصنّف کے طرزِ تحریر اور اس کے تجزیہ و خصوصیات کا بیان تشنہ رہتا ہے جب تک ہر قسم کی تحریر کے نمونے اور مثالیں پیش نظر نہ ہوں۔ میں نے "داستان تاریخ اُردو" میں اِس کمی کو پورا کرنا چاہا ہے۔ میری تنقیدیں شاید تلخ و بے باک نظر آئیں۔ لیکن بے لاگ اور بے لوث بھی ثابت ہوں گی۔ میں نے صحیح تعریف اور جائز حمایت بھی ایسی کی ہے کہ کسی دوسرے موٴرخ یا تذکرہ نویس نے نہیں کی۔ میرے نزدیک یہ سب ایک تاریخ و تذکرہ کے ضروری اجزا تھے۔ بغیر اس روشنی کے کسی تصنیف و مُصنّف کے مطالعہ کا صحیح راستہ نظر نہیں آتا" "سرسیّد کی جامعیّت حیرت انگیز ہے۔ اکیلے سرسیّد کی تحریر میں عالمانہ و فلسفیانہ، متین و مزاحی، نرم و گرم ہر طرح کا اسلوب موجود ہے۔ شبلی اپنے اسلوب کے توازن و تناسب، صحت و پختگی میں سب معاصرین سے بڑھے ہوئے ہیں۔ لیکن سرسیّد کے جوش کی ان میں کمی ہے۔ حالی ان دونوں کے درمیان میں ہیں۔ اگرچہ جوش اُن میں بھی نہیں ہے۔ حالی نے سرسید کی صحت و صفائی کو آگے بڑھایا، لیکن حُسن و موزونیت میں شبلی سے پیچھے رہے۔ نذیر احمد اور محمد حسین آزاد اپنے اپنے رنگ کے مُوجد و خاتم ہوئے۔ سرشار و سجاد حسین "پنچ" طرزِ ظرافت کے علمبردار تھے۔" "حالی اُردو کے "عناصرِ خمسہ" میں وہ ضروری عنصر تھے جس کے بغیر مزاجِ اُردو صحیح و معتدل نہیں رہتا، بلکہ جو علم و ادب کی نفسِ حیات کا جزو لاینفک ہے۔ حالی اور اُن کے ہمعصروں نے تیس چالیس برس کے اندر وہ لٹریچر پیدا کر دیا جس کے بغیر کسی زبان کی تکمیل نہیں ہو سکتی اور جس کا کوئی نمونہ پہلے سے موجود نہ تھا۔ حالی کی تصانیف سے پہلے سرسید مذہبی و اصلاحی مقالات، محمد حسین آزاد تذکرہ و تاریخ، نذیر احمد ناول شروع کر چکے تھے۔ سیرت و سوانح اب تک کسی نے نہ لکھے تھے۔ حالی پہلے سیرت نگار ہیں۔ تنقیدِ شعر و ادب بھی اب تک اُردو میں نہ آئی تھی۔ حالی پہلے تنقیدی مُصنّف بھی ہیں۔ شبلی نے سیرت و تنقید دونوں میں بڑا کام کیا۔ لیکن حالی کے بعد شروع کیا۔" "میر ناصر علی شاعر نہ تھے۔ لیکن نثر میں شاعری کرتے تھے۔ یہ نثر کی شاعری مولوی عبدالحلیم شرر نے ایسی کی کہ کمال کی حد کر دی۔ لیکن اس کی ایجاد و ابتدا کرنے والوں میں میر ناصر علی ہی تھے۔ شرر کا بڑا کمال یہ ہے کہ انہوں نے نئے خیالات اور خیال آفرینی کے اسلوب، انگریزی انشا پردازوں سے لئے اور اُن کو اُردو زبان کے طرز ادا کے ساتھ اور شعرائے ہند کے مذاق ادب کے مطابق مرتب کر کے پیش کیا۔ یہی کام میر ناصر علی اور عبدالحلیم شرر سے پہلے مولوی محمد حسین آزاد نے "نیرنگِ خیال" میں کیا تھا۔ لیکن وہ "تمثیلی رنگ" ہونے کے سبب سے صنفِ خاص تھا۔ شرر اور ناصر علی صرف تمثیلی کے پابند نہ تھے۔ نئی بات نئے انداز سے لکھنا چاہتے تھے اور پاکیزہ خیالات پیدا کرنا چاہتے تھے۔"

(داستان تاریخ اُردو ۱۹۴۱ء)



حافظ محمود شیرانی

(۱۸۸۰-۱۹۴۶ء)

شیرانی کی پیدائش۔ ۱۸۸۰ء میں ہوئی آپ کا وطن ریاست ٹونک (رجپوتانہ ہے) تعلیم لاہور پھر لندن میں حاصل کی۔ لندن میں سرٹامس آرنلڈ نے (جو لاہور میں پروفیسر رہ چکے تھے) محمود شیرانی کو ریسرچ کے کام میں اپنا مددگار بنالیا۔ تحقیقات کا شوق اسی وجہ سے ہوا۔ ۱۹۲۱ء میں لندن سے لاہور آئے۔ اسلامیہ کالج اور اورینٹل کالج لاہور میں پروفیسر ہو گئے۔ قلمی کتابیں اور تاریخی سکے جمع کرنے کا بیحد شوق تھا۔ ۱۹۴۶ء میں انتقال ہوا۔ مشہور شاعر اختر شیرانی انہی کے صاحبزادے تھے۔ محمود شیرانی نے تحقیق و تنقید میں حیرت انگیز کام کیا ہے۔ تحقیق میں محنت پسندی اور سخت کوشی کے جوہر نے ان کی عظمت کو چار چاند لگا دیئے۔ وہ واقعات کی صحت و صداقت پر جان دیتے تھے۔ اسی لئے اُنہوں نے تحقیق کا معیار بہت بلند کر دیا ہے۔ محمود شیرانی بلند پایہ محقق، نقاد اور صاحب ذوق تھے۔ فردوسی کے ''شاہنامہ'' سے تو ان کو عشق تھا۔ شیرانی نے اپنی تحقیق سے ثابت کیا ہے کہ ''خالق باری'' اور ''قصہ چہار درویش'' امیر خسرو کا ''دیوان خواجہ اجمیری'' اور ''پرتھوی راج راسا'' (پرتھوی راج کے درباری شاعر چاند بردائی) کی تصنیف نہیں ہیں۔ ''پنجاب میں اُردو'' میرے خیال میں اُردو کا وجود انہی ایام سے ماننا ہوگا جب سے مسلمان ہندوستان میں آباد ہیں'' اُردو دہلی کی قدیم [1] زبان نہیں ہے بلکہ وہ مسلمانوں کے ساتھ دہلی جاتی ہے۔ چونکہ ''غوریوں'' کے عہد میں دارالسلطنت لاہور سے دہلی منتقل ہو جاتا ہے تو مسلمان پنجاب سے بڑے پیمانے پر ہجرت کر کے دہلی جاتے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ وہ پنجاب سے کوئی زبان اپنے ساتھ لے کر گئے ہوں گے اسلامی سلطنت دہلی پہنچ کر بہت جلد مرکزی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ اس لئے یہ زبان اسلامی لشکروں، مہاجروں اور نو آبادکاروں کے ساتھ ہندوستان کے ہر گوشے میں پہنچ جاتی ہے۔ خلجی اس کو گجرات اور دکن پہنچاتے ہیں۔ گویا دکن اور گجرات میں اردو کے علیحدہ علیحدہ مرکز قائم ہو جاتے ہیں۔ شاہان گجرات اردو میں بات چیت کرتے ہیں اور شاہان دکن اردو کو دفتری زبان بناتے ہیں۔ ''اردو'' جب محمد تغلق نے دہلی کو اجاڑ کر دکن کو ہندوستان کا پایہ تخت بنا دیا تو دلی والے دلی کا تحفہ یعنی ''زبان اردو'' بھی ساتھ لائے۔ یہ پہلا موقع تھا جب اردو زبان دکن کی گلیوں اور بازاروں میں بولی جانے لگی۔ محمد تغلق کی وفات کے بعد ''حسن بہمنی'' تاجدار دکن بن گیا اور اس عہد میں اردو زبان دکن میں رواج پاتی رہی۔ بابر کے آمد سے قبل اردو ادبیات کی ترویج کے لئے خاندان ''قطب شاہیہ'' کا قدم پیش پیش ہے۔ بالخصوص محمد قلی قطب شاہ کا نام اردو کی تاریخ میں ''آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہے،'' جس کے عہد میں مستقل اردو تصانیف لکھی جانے لگی''۔ فردوسی (ایران کا زندہ جاوید شاعر) شاہ نامہ فردوسی کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ شاہ نامے سے معلوم ہوتا ہے کہ محمود غزنوی کی فرمائش پر نہیں لکھا گیا، فردوسی نے اپنی بیوی کے کہنے پر لکھنا شروع کیا تھا، البتہ غزنی نے آ کر ختم کیا اور سلطان محمود کے نام معنون کر دیا۔ ''ہجو'' فردوسی نے نہیں لکھی بعد میں شامل کی گئی ہے۔ سلطان محمود کے ساتھ فردوسی کے تعلقات بہت اچھے ہیں۔ دربار میں آمد و رفت ہے۔ نہ معلوم کن وجوہات کی بنا پر سلطان ناراض ہو گیا اور فردوسی انعام سے محروم رہا۔ فردوسی مایوس ہو کر غزنی سے رخصت ہو جاتا ہے۔ بہر حال یہ امر واقعہ ہے کہ فردوسی کو سلطان محمود کے دربار سے بے نیل مرام جانا پڑا اور پیاسا کنوئیں سے اور قطرہ دریا سے محروم ہو گیا۔ (مقالات شیرانی۔ ۱۹۴۸ء)

---

[1] بابائے اُردو مولوی عبدالحق پروفیسر شیرانی کی کتاب ''پنجاب میں اُردو'' کے تبصرہ میں لکھتے ہیں۔ ''قابل مصنف اس امر کو تسلیم کرتے ہیں کہ ''اُردو زبان اسلامی دور میں دہلی کے اثرات میں بنی۔ امیر خسرو اور ابوالفضل اسی زبان کو ''دہلوی'' کہتے ہیں'' یہ شیرانی صاحب کا قیاس ہے کہ اُردو پنجاب سے دہلی گئی جو کسی طرح قابل تسلیم نہیں۔ یہ بھی صحیح نہیں کہ مسلمانوں کی ہجرت پنجاب سے یکبارگی۔ اس کثیر مقدار میں ہوئی کہ وہ دہلی پر اس طرح چھا گئے کہ انہیں کی زبان رائج ہو گئی اور سب اہل دہلی اور نواح دہلی نے اسے اختیار کر لیا۔ دوسرے پنجاب کی حالت اُس زمانے میں ناقابل اطمینان تھی اور ایسی نہ تھی کہ وہاں کوئی زبان مستقل طور سے بن سکتی۔'' (تنقیدات عبدالحق ۹۲۸ء)



رتن ناتھ سرشار

(۱۸۴۶-۱۹۰۲ء)

سرشار ۱۸۴۶ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ معزز کشمیری خاندان سے تھے۔ کیننگ کالج لکھنؤ میں تعلیم پائی۔ ۱۸۷۸ء میں منشی نول کشور کے ''اودھ اخبار'' کے ایڈیٹر ہو گئے۔ اُسی اخبار میں ''فسانۂ آزاد'' لکھنا شروع کیا۔ جو اپنی دلکش منظر نگاری، رومان اور ظرافت کی وجہ سے بے حد مقبول ہوا۔ اور تا حال اُسی دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے۔ ''فسانۂ آزاد'' اُردو ناول نویسی کے فن میں منفرد اور امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں لکھنؤ کے مٹے ہوئے تمدن کی تصویر کشی بڑی خوش اسلوبی سے بیان کی گئی ہے۔ جہاں تک انشا پردازی، اسلوب بیان اور مکالمہ نگاری کا تعلق ہے، اُردو کے ناول نویسوں میں سرشار بہت کامیاب ہیں۔ سرشار کو بیگماتی زبان، معاشرت اور رسوم کا گہرا شعور تھا۔ ''فسانۂ آزاد'' وسیع، گہری اور بھرپور زندگی کا مرقع ہے اور ''خوجی'' سرشار کے اِس شاہکار کا زندۂ جاوید کردار۔ اُردو ناول کی تاریخ میں ''فسانۂ آزاد'' ہمیشہ زندہ رہے گا۔ سرشار اُردو کے مشہور مصنف، زبردست زبان دان، ظریف، بذلہ سنج اور ایک طرزِ خاص کے مُوجد بھی ہیں۔ ۱۹۰۲ء میں حیدر آباد دکن میں انتقال ہوا۔ بٹیر: ''لکھنؤ کے نواب صاحب، میاں آزاد کو بٹیر خانے لے گئے۔ مُصاحب نے ایک بٹیر دکھا کر کہا کہ اللہ رکھے کا ای منجھولا جنوا ہے۔ ''صف شکن'' جو آپ نے سُنا ہو، یہی حضرت ہیں۔ لندن تک خبر کے کاغذ میں اس کا حال چھپ گیا ہے۔ میری جان کی قسم، ذرا اس کی آن بان تو دیکھئے (بوسہ دے کر) ہائے کیا بانکا بٹیر ہے۔ یہ نواب صاحب کے ''دادا جان'' کے وقت کا ہے یہ بزرگوں کی نشانی ہے۔ بٹیر کیا ہفت خواں منازل پہلوانی ہے۔ ہفت اقلیم میں لاثانی ہے۔ مُرغ کو لپک کر لات مارے تو وہ بھی چیں بول جائے۔ جیسے باز اور پدّے کی لڑائی۔ شاہی فوج میں جب دگلے والی پلٹن بگڑی تھی تو ہمارے حضور ہی بھیجے گئے۔'' ''خوجی بوڑھے ہیں۔ مگر وہ اپنے آپ کو جوان، بلکہ بچّہ سمجھتے ہیں۔ کمزور اتنے کہ اگر ہوا چھو جائے تو گر پڑیں۔ دُبلے پتلے ایسے کہ کوئی بچہ چپت جڑ دے تو سات لڑکنیاں کھائیں۔ بدصُورت اس قدر کہ کوئی دیکھ لے تو ڈر جائے۔ مگر سمجھتے یہ ہیں کہ میں نہایت موٹا تازہ، نہایت طاقتور، نہایت خوبصورت ہوں۔ حوصلہ ایسا کہ ہزار مرتبہ پٹے، جُوتیاں کھائیں، مگر خم ٹھونک کر لڑنے کو تیار۔ میاں خوجی میں ایک وصف یہ تھا کہ بے سوچے سمجھے، بے دیکھے بھالے لڑ پڑتے تھے۔ کیا ممکن کہ ذرا اُف کریں۔ وہی تیور، وہی دم خم۔'' ''میاں خوجی نے ٹٹوی کو چھوڑ دیا۔ کہ جہاں جی چاہے آزادی سے چرے۔ وہ سیدھی بُوٹ کے کھیت میں پہنچی اور لگی چرنے۔ اتنے میں کسان اور اُس کی جورو بھی لپک کر پہنچی اور کوسنا شروع کیا۔ کسان نے ٹٹوی کو خوب مارا۔ اتنے میں میاں جی نے للکارا۔ خبردار خبردار! اس حرکتِ ناشائستہ سے باز آ، ورنہ فرقدان پر ایک بال باقی نہ رہے گا، ضربتِ پاپوش سے بوکھلا جائے گا۔ کسان نے اتنی بڑی گستاخی کی کہ ٹٹوی کو مارا پھر بھلا اِن کو تاب کہاں۔ تڑ سے گتھ گئے۔ وہ گنوار آدمی اور انتہا کا کرارا۔ یہ دُبلے پتلے مہین آدمی۔ ہوا کے جھونکے میں اُڑ جائیں۔ اُس نے اِن کی گردن دبوچی اور گدّ سے زمین پر پھینکا۔ پھر جھپٹنے کی کوشش کی تو کسان کی جُورو چمٹ گئی۔ اور لگی ہاتھا پائی ہونے۔ اُس نے گھونسا جمایا اور ان کے پٹے پکڑ کر پھینکا تو چاروں خانے چت، دو تھپڑ رسید کئے۔ ایک اِدھر ایک اُدھر اور کسان کھڑا ہنس رہا ہے۔ کسان کی جُورو تو ٹھونک ٹھانک اور پیٹ پاٹ کر چل دی۔ آپ نے پکارنا شروع کیا۔ ''قسم بابا جان کی جو کہیں قرولی پاس ہوتی تو اِن دونوں کی لاشیں اس وقت پھڑکتی ہوتیں۔'' اِس پر گاؤں والوں نے خوب قہقہہ اڑایا تو خوجی نے کہا۔ ''بھئی! عورت ذات تھی، رحم آ گیا۔'' ''لکھنؤ کا محرم۔'' ''شیعۂ غمِ حُسینؑ میں برہنہ سر، برہنہ پا، سیاہ ماتمی پوشاک پہنے، ماتم دگر یہ زاری کرتے ''تال کٹورے'' کی کربلا جا رہے ہیں۔'' (فسانۂ آزاد) ۱۸۷۹ء۔



محمد ہادی رُسوا

(۱۸۵۱-۱۹۳۱ء)

رسوا کی پیدائش ۱۸۵۹ء میں لکھنؤ میں ہوئی۔ والد کا نام مرزا محمد تقی۔ مرزا رسوا مایۂ ناز ادیب تھے اور اُن کو بہت سی زبانوں پر عبور تھا۔ علم کا جس قدر شوق تھا، اُسی قدر قبولِ علم کی صلاحیت بھی تھی۔ خود فرمایا کرتے تھے۔ ''مجھ کو کبھی فلسفہ کا جنون ہے، کبھی ریاضی کا، کبھی سائنس کا، کبھی شعروشاعری کا تو کبھی ناول نگاری کا۔ آپ'' دارالترجمہ حیدرآباد دکن میں ملازم تھے۔ وہیں ۱۹۳۱ء میں انتقال ہوا۔ ''اُمراؤ جان ادا'' مرزا رسوا کا مایۂ ناز شاہکار ہے اور اسی سے اُن کا نام زندہ ہے۔ مرزا رسوا کی کامیابی کا راز زیادہ تر اُن کی شیریں بیانی میں مُضمر ہے۔ لکھنؤ کی ٹکسالی زبان نے اِس ناول کو اور بھی زیادہ دلکش اور دلچسپ بنادیا ہے۔ رسوا نے فلسفیانہ فکر، نفسیاتی تجزیہ، ادبی اور شاعرانہ ذوق اور فنی حُسنِ تربیت کو یکجا کر کے اُمراؤ جان ادا کو ناول نگاری کے فن میں بلندی، گہرائی اور گیرائی، لطافت و نزاکت اور اُن سب کے ساتھ ساتھ تاثیر کی اقدار کا حامل بنایا اور اس طرح ناول نگاری کا فن پہلی مرتبہ عروج پر پہنچا۔ آج بھی اُردو ادب کو اُن کے ناول ''اُمراؤ جان ادا'' پر ناز ہے جو اُردو زبان کا بہترین سرمایہ ہے۔ اُمراؤ جان ادا (طوائف) برسات کے دن ہیں گھٹا آسمان پر چھائی ہوئی ہے۔ پانی تل دھار، اوپر دھار برس رہا ہے۔ بجلی چمک رہی ہے بادل گرج رہا ہے۔ میں بُو حسینی کی کوٹھڑی میں اکیلی پڑی ہوں۔ چراغ گُل ہو گیا ہے اور اندھیری وہ کہ ہاتھ نہیں سوجھتا۔ جب بجلی چمکتی ہے مارے ڈر کے دُلائی سے منہ ڈھانپ لیتی ہوں۔'' ایک خاص قسم کی رسم (جس سے میں بالکل ناواقف تھی) کے ادا ہونے کے بعد بسم اللہ سے بسم اللہ جان اور خورشید سے خورشید جان ہوگئیں، بیبا کی، کی سند حاصل ہوگئی، آزادی کا خلعت مل گیا، اور مردوں کے ساتھ بے تکلف ہنسی مذاق کرنے لگی تھیں۔ سب کے کمرے جدا جدا سج دئے گئے۔ نواڑ کے پلنگ ڈوریوں سے کسے ہوئے تھے، فرش پر ستھری چاندنی بچھی ہوئی، بڑے بڑے نقشی پاندان، خس دان، خاصدان، اگالدان، اپنے اپنے قرینوں سے رکھے ہوئے۔ دیواروں پر جلی آئینے، عمدہ تصویریں، چھت میں چھت گیریاں لگی ہوئی جس کے درمیان ایک مختصر سا جھاڑ، اِدھر اُدھر عمدہ ہانڈیاں، سرِ شام سے دو کنول روشن ہو جاتے، دو، دو مہریاں، دو، دو خدمت گار ہاتھ باندھے کھڑے ہیں، خوبصورت نوجوان، رئیس زادے ہر وقت دل بہلانے کو حاضر، چاندی کی گُڑگُڑی مُنہ سے لگی ہوئی ہے۔ سامنے پاندان کُھلا ہوا ہے، ایک ایک کو پان لگا کے دیتی جاتی ہیں، چہلیں ہوتی جاتی ہیں، اُٹھتی ہیں تو لوگ ''بسم اللہ'' کہتے ہیں۔ چلتی ہیں تو لوگ آنکھیں بچھائے جاتے ہیں۔ یہ ہیں کہ کسی کی پرواہ نہیں کرتیں۔ جو ہے اُنہی کے حکم کے تابع ہے۔ حکومت بھی وہ کہ زمین آسمان ٹل جائے مگر ان کا کہنا نہ ٹلے۔ فرمائشوں کا تو ذکر ہی کیا، بن مانگے لوگ کلیجہ نکال کے دے دیتے ہیں۔ کوئی دل ہتھیلی پر رکھے ہوئے ہے، کوئی جان قربان کرتا ہے، یہاں کسی کی نذر ہی قبول نہیں ہوتی، کوئی بات نظر میں نہیں سماتی، بے پروائی یہ کہ کوئی جان بھی دیدے تو ان کے نزدیک مال نہیں، غرور ایسا کہ ہفت اقلیم کی سلطنت ان کی ٹھوکر پر ہے ناز وہ۔ جو کسی سے اٹھایا نہ جائے مگر اٹھانے والے اٹھاتے ہیں۔ انداز وہ جو مار ہی ڈالے مگر مرنے والے مرہی جاتے ہیں۔ اِدھر اس کو رُلایا، اُدھر اُسے ہنسایا۔ کسی کے کلیجہ میں چٹکی لے لی، کسی کا دل تلووں سے مسل ڈالا۔ بات بات میں رُوٹھی جاتی ہیں۔ لوگ منا رہے ہیں۔ قول کیا اور مُکر گئیں، قسم کھائی اور بھول گئیں۔ محفل بھر میں سب کی نگاہ ان کی طرف ہے، یہ آنکھ اُٹھا کے بھی نہیں دیکھتیں۔ پھر جدھر دیکھ لیا اُدھر سب دیکھنے لگے۔ جس پر اُن کی نگاہ پڑتی ہے، اُس پر ہزاروں نگاہیں پڑتی ہیں۔ رشک کے مارے لوگ جلے جاتے ہیں اور یہ جان جان کے جُلا رہی ہیں اور لطف یہ کہ دل میں کچھ نہیں۔ وہ بھی سچ یہ بھی سچ، فقط بناوٹ۔ (اُمراؤ جان ادا)



عبدالحلیم شرر

(۱۸۶۰-۱۹۲۶ء)

شرر کی پیدائش ۱۸۶۰ء میں بمقام لکھنؤ ہوئی تھی۔ پھر علمائے فرنگی محل لکھنؤ کے زیرِ سایہ تعلیم حاصل کی، ۱۸۸۱ء میں "اودھ اخبار" کے اسسٹنٹ ایڈیٹر ہوئے۔ پھر ۱۸۸۷ء میں اپنا مشہور رسالہ "دلگداز" لکھنؤ سے جاری کر کے تاریخی ناول لکھنے شروع کیے۔ ۱۸۹۵ء میں یورپ کی سیاحت کی۔ اُردو میں تاریخی ناول نگاری، کا سہرا شرر کے سر ہے۔ نثر میں شاعرانہ تخیل کا اظہار، تاریخی اور عاشقانہ خیالات کا بیان کرنا شرر کا فطری حصہ تھا۔ قدرتی مناظر کی عکاسی اس انداز سے کی ہے کہ سبحان اللہ! مولانا شرر صرف ادیب اور ناول نگار ہی نہ تھے، بلکہ مورّخ و نقاد بھی تھے۔ شرر اُردو لٹریچر کی دنیا میں ایک چابکدست مصوّر اور جذبات انسانی کے اظہار پر قادر تھے۔ انہوں نے اپنے ناولوں میں پُر تکلف منظر نگاری، زبان کی چاشنی، چٹخارے اور ایک خاص قسم کی انشا پردازی کو ایک فن کی حیثیت سے جگہ دی ہے۔

"فردوس بریں" مولانا کا وہ مشہور ناول ہے جو فن کی کسوٹی پر پورا اترتا ہے۔ شرر کے علمی اور ادبی مضامین بھی خاص شہرت رکھتے ہیں جو اُردو ادب کا بیش بہا خزانہ ہیں۔ ۱۹۲۶ء میں لکھنؤ میں وفات پائی۔ "معشرت بادشاہ کے محل میں نہیں، غریب کے جھونپڑے میں ملتی ہے۔" بزم قدرت۔ اندھیری رات میں آسمان نے اپنے شب زندہ دار دوستوں کی محفل آراستہ کی ہے، تارے کھلے ہیں اور اپنی بے ترتیبی اور بے نظمی پر عجب بہار دکھا رہے ہیں۔ دیکھو ان پیارے خوشنما تاروں کی صورت پر کیسی زندہ دِلی اور کیسی تروتازگی پائی جاتی ہے۔ پھر یکایک مہتاب کا ایسا حَسین اور نُورانی مہمان مشرق کی طرف سے نمودار ہوا اور گورے گورے تارے اپنی بے فروغی پر افسوس کر کے غائب ہونے لگے۔ ماہتاب، آسمان کے نیلگوں اطلسی دامن سے کھیلتا ہوا آگے بڑھا اور ہمارے غریب کدوں کو روشن کر کے بزمِ قدرت میں نہایت لطیف اور خوشگوار دلچسپیاں پیدا کر کے خوشی خوشی صحنِ فلک کی سیر کرتا ہوا مغرب کی طرف گیا اور غائب ہوگیا۔ پھر آفتاب بڑی آب وتاب سے ظاہر ہوا مُرغانِ سحر کے نغموں کی آواز کانوں میں آنے لگی۔ دیکھا تو شمع جھلملا رہی ہے۔ نسیم سحر اٹکھیلیاں کرتی ہوئی آئی اور غنچوں کے پہلو گدگدانے لگی" (مضامینِ شرر)۔

فردوسِ بریں۔ زمّرد اور حُسین میں حد درجہ عشق تھا۔ اس لئے ارضی جنت سے زمّرد نے حُسین کو خط لکھا کہ اگر میرا شیدا اور میرا آرزومند ہے تو جب تک مقصد بر نہ آئے شیخ کی خدمت اور غلامی کرنا۔ یہی شخص تجھ کو مجھ سے ملا سکتا ہے۔" "شیخ علی وجودی نے ایک بار پھر گرم لوہے پر آخری ضرب لگائی۔ شیخ۔ بہتر تو زمّرد سے ملے گا، اُس کے وصل سے کامیاب ہوگا۔ مگر اس کے لئے اچھی طرح تیار ہے؟ حُسین۔ دل و جان سے۔ شیخ۔ دیکھ تجھے تامل نہ ہو۔ حُسین۔ ذرا نہیں۔ شیخ۔ تیرے دل میں شک اور بد عقیدگی نہ ہو۔ حُسین۔ ہرگز نہیں۔ شیخ۔ وہ جرأت کا کام ہے۔ حُسین۔ میں جان لڑا دونگا۔ شیخ۔ اس میں خطرے بہت ہیں۔ حُسین ہوں۔ شیخ۔ تو سُن۔ حُسین۔ ارشاد۔ شیخ ابھی نہیں، دل مضبوط کر لے۔ حُسین خوب مضبوط ہے شیخ۔ اپنے استاد امام نجم الدین نیشاپوری کے حلقے میں پھر شریک ہو اور جس وقت موقع ملے اُن کو قتل۔ حُسین کے لئے یہ ضرب توقع سے زیادہ سخت اور کاری ثابت ہوئی۔ اُس نے ایک چیخ ماری اور بے ہوش ہوگیا۔" "صبح کا وقت تھا اور نسیم کے جھونکے چل رہے تھے کہ مرغانِ سحر نے اپنے نشیمنوں سے نکل نکل کر حُسین کو خوابِ بے ہوشی سے جگا دیا۔ خمار کی سی کروٹیں بدل کے آنکھیں ملتا ہوا اٹھا اور اپنے آپ کو اس حالت میں پایا کہ ایک طلا کار اور مرصّع کشتی میں سوار ہے اور نازک بدن اور پری جمال لڑکیوں کی کوشش سے وہ کشتی ایک دلکش نہر کے کنارے آ کے ٹھہری ہے۔ نرم اور نظر فریب۔ سبزے کو شفاف اور پاک وصاف پانی اپنی رَوانی میں چومتا ہوا نکل جاتا ہے۔ اِن خوبصورت ملاّحوں کے کہنے کے بموجب حُسین کشتی سے اُترا اور "قصرِ زُمردی" کے دروازہ پر جا پہنچا۔ "زمرد" استقبال کے لئے موجود تھی۔ شام کو زمرّد، حُسین کو ساتھ لئے قصرِ زمُردی سے باہر نکلی اور لالہ زار میں زمُرد اور حُسین طلائی تخت پر جا کے بیٹھے۔ تخت کے دونوں جانب دو حوض تھے۔ سامنے حُوریں بیٹھ کے عجب دلربا اور وجد میں لانے والی دُھن میں گانے لگیں۔ حُسین اِس لطفِ صحبت کا دل ہی دل میں مزہ لینے لگا۔ (فردوسِ بریں ۱۸۹۹ء)



علامہ راشد الخیری

(۱۸۷۰-۱۹۳۶ء)

مولانا محمد عبدالراشد نام۔ قلمی نام راشد الخیری جو ۱۸۷۰ء میں دہلی میں پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم پائی۔ مولوی نذیر احمد دہلوی کی طرح راشد الخیری بھی عورتوں کی اصلاح وترقی کے حامی تھے۔ لیکن تعلیم سے زیادہ تربیت کو عورت کی زندگی کا زیور سمجھتے تھے۔ مولانا راشد الخیری کی تحریروں میں عورتوں کی مظلومیت پر مُردوں کے دل پسیج گئے۔ انہوں نے اس مظلوم ہستی کی بہبود اور مرتبہ بلند کرنے کے لئے اپنی زندگی وقف کردی تھی۔ یہ مصرعہ انہی پر صادق آتا ہے "کاغذ پہ رکھ دیا ہے کلیجہ نکال کے۔" ان کی عبارت نہایت درد انگیز اور تاثیر سے لبریز ہوتی ہے۔ اسی لئے "مصورِ غم" کے لقب سے مشہور ہیں۔ اِن کے بیان میں دلکشی اور لطافت ہوتی ہے یہ صاحب طرز، مستند، ادیب اور انشاپرداز ہیں۔ ان کی اعلیٰ تصانیف "صبح زندگی۔ شام زندگی اور شب زندگی" ہیں۔ ۱۹۳۶ء میں دہلی میں وفات پائی۔ فاطمۃ الزہرؓا۔ سعی ہے اُن پاک رُوحوں پر جو خاکِ عرب سے اٹھیں اور علم وفضل کے ایسے دریا بہائے کہ نہ صرف خطۂ مخصوص بلکہ ایک دُنیا اُن سے سیراب ہوئی۔ ادب کی اُن صحبتوں اور علوم کی اُن مجلسوں میں ہم بنت الرسولؐ "فاطمۃ الزہراؓ" کو ممتاز جگہ پر جلوہ افروز دیکھتے ہیں۔ سونے پر سہاگہ ان کی خانگی زندگی ہے۔ ایثار کے متبرک گلدستے ہاتھوں میں، صبر وشکر کے خوشنما ہار گلے میں اور انسانیت کا چمکتا ہوا "تاج" سر پر۔ بی بی خدیجہ کا یہ درخشندہ جوہر سرزمین عرب سے اٹھ کر بساط دنیا پر قمرِ چہاردہم کی طرح جگمگایا اور رسولِ عرب کی یہ پیاری بچی جو آسمانِ حیات پر ایک ایسے لعل کی طرح چمکی جس کی روشنی آج تک تمام دنیا کو منوّر کررہی ہے۔ سیر کی تمام کتابیں اس امر پر متفق ہیں کہ بی بی فاطمہؓ رفتار میں، گفتار میں، عادات میں رسولِ اکرمؐ سے بہت مشابہ تھیں۔ خود رسالت مآب ان کی عزت کرتے تھے۔ اور جب وہ تشریف لاتی تھیں تو آپ کھڑے ہوجاتے تھے۔ اور ان کا ہاتھ پکڑ کے اپنے پاس بیٹھاتے تھے۔ بعد رسول جب دل میں ہُوک اٹھتی اور رسول کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی تو بی بی فاطمہؓ بیتاب ہوکر دیوانہ وار مزارِ مبارک پر جا کر گرتیں، روتی اور کہتیں۔ "آج میرا باپ مجھ سے جدا ہوگیا۔ وہ شمع جس نے عرب کے جنگل روشن کردئے گل ہوگئی" (الزاھرا) بہادر شاہ ظفر (آخری تاجدار ہند)۔ (شاہ ظفر جن کی سلطنت غارت ہوئی، گھر لُٹ گیا۔ ایک قیدی کی حیثیت میں ہوں اور اُن کو اپنے دو جوان بیٹوں اور پوتے کے بیگناہ قتل کی خبر ملے تو وہ دیواروں سے سر نہ پھوڑیں تو اور کیا کریں)۔ "زینت محل میرے پہلو میں دل ہے، پتھر نہیں۔ بہادر شاہ، انسان ہے جانور نہیں۔ مجھ کو سنبھالو۔ میرا دل نکلا۔ میری جان چلی۔ اچھا اچھا پیارے بچو! جاؤ۔ بڈھا مظلوم باپ جس کی تقدیر میں تمہارا صدمہ دیکھنا تھا۔ مجبور ہے۔" "جن کی آنکھوں کی ایک گردش دنیا کو مالا مال کرتی وہ عمر بھر روئیں اور اتنا روئیں کہ آنسو خشک ہوگئے۔ جو ہاتھ امورِ سلطنت کو ایک اشارہ میں زیروزبر کردیتے انہوں نے جوان جوان بیٹوں کے جنازے ڈھوئے اور اتنے ڈھوئے کہ اب سکت باقی نہ رہی اور خاندانِ شاہی کی ناموس میری آنکھوں کے سامنے تباہ و برباد ہوئی۔ میرے بچوں پر کڑاکے کے فاقے گزرے، کلیجے کے ٹکڑے میرے سامنے خون میں نہائے۔" (وداعِ ظفر) مودودہ اپنے بچے کو گود میں لئے قبرستان کے اندر داخل ہوئی اور گورکن سے کہا اس کو دفن کردیجئے۔ میرے پاس معاوضہ کچھ نہیں۔ اس لئے میں اس بچے کو کفن بھی نہ دے سکی۔ گورکن۔ بس تو آگے بڑھ۔ مودودہ۔ آپ مجھے زمین کھودنے کیلئے اوزار دیدیجئے میں خود دفن کردوں گی۔ گورکن۔ کدال پھاوڑے کا کرایہ، زمین کی قیمت دینی ہوگی۔ نہیں تو چل یہاں سے۔ اب شام ہوچکی تھی۔ نماز کا وقت تھا۔ بچہ کی لاش ایک قبر پر رکھ کر مودودہ نے نماز پڑھی اور مُردے کو لیکر چلی۔ چاندنی رات تھی پھر۔ دریا سامنے لہریں لے رہا تھا۔ کنارے پر پہنچی اور آسمان کی طرف دیکھ کر کہا۔ کیا کروں کوئی دفن نہیں کرتا۔ اتنا کہہ کر مودودہ نے بچہ کا منہ کھول کر پیار کیا اور دریا میں پھینک دیا اور باآوازِ بلند "اللہ اکبر" کہہ کر آگے بڑھی۔

ا امام حسن فرماتے ہیں۔ میری والدہ نماز کے بعد گریہ وزاری میں مصروف رہتی تھیں۔ خوف خدا سے روتی تھیں اور اُن کی دعائیں مخلوقِ خدا کے واسطے ہوتی تھیں" (الزہرا مصنفہ راشد الخیری)

(۵۰)



پریم چند

(۱۸۸۰-۱۹۳۶ء)

منشی پریم چند ۱۸۸۰ء میں بنارس میں پیدا ہوئے۔ بی۔ اے تک تعلیم حاصل کر کے محکمۂ تعلیم میں اعلیٰ عہدہ پر فائز ہوئے۔ وطن کی محبت سے سرشار ہو کر افسانوں کا پہلا مجموعہ ''سوزِ وطن'' ۱۹۰۹ء میں شائع کیا۔ برٹش گورنمنٹ کو اس کتاب میں بغاوت کے جذبہ کی جھلک نظر آئی تو اُس کو ضبط کرلیا۔ پریم چند نے اپنی آزادی سلب ہوتے دیکھی تو ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور تمام عمر تصنیف وتالیف میں گزار کر ۱۹۳۶ء میں بنارس میں وفات پائی۔ پریم چند شہرۂ آفاق ادیب اور بے مثل افسانہ نگار تھے۔ اُنہوں نے دیہاتی زندگی کی بڑی خوبی سے تصویر کشی کی ہے اور اُن کے افسانوں میں حقیقت نگاری اپنے شباب پر ہے۔ پریم چند کے افسانوں میں رُومانی اور وجد آفریں تخیلی دنیا کے مرقعے بھی ہیں۔ پریم چند کی زبان سادہ، آسان اور شگفتہ ہے۔ اُن کی نظر وسیع اور مشاہدہ عمیق ہے۔ پریم چند نے مختصر افسانہ نویسی کی طرح جدید رنگ کے ناول ''میدانِ عمل'' اور ''گئودان'' بھی لکھے۔ لیکن ان کا اصل کارنامہ افسانہ نگاری ہے۔ جہاں اُن کا فن اپنے عُروج پر نظر آتا ہے۔ پریم چند ادب کے متعلق لکھتے ہیں: ''جس ادب سے ہمارا ذوق صحیح نہ بیدار ہو، ہمارا جذبۂ حُسن نہ جاگے، جو ہم میں سچا ارادہ اور مشکلات پر فتح پانے کے لئے سچا استقلال نہ پیدا کرے وہ آج ہمارے لئے بیکار ہے۔ اس پر ادب کا اطلاق نہیں ہوسکتا؟ ہم ادب کو محض تفریح اور تعیش کی چیز نہیں سمجھتے۔ ہماری کسوٹی پر اب وہ ادب پورا اُترے گا جس میں تفکر ہو، آزادی کا جذبہ ہو، حُسن کا جوہر ہو، تعمیر کی رُوح ہو، زندگی کی حقیقی روشنی ہو جو ہم میں حرکت، ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے، سُلائے نہیں کیونکہ اب زیادہ سونا موت کی علامت ہوگی۔''
پھر ایک جگہ لکھتے ہیں: مصیبتیں مصیبتیں نہیں، وہ ایک آزمائش ہے۔ جس کا نتیجہ کامیابی ہے۔ مصائب وآلام ہی سے انسان میں انسانیت اور مستقل مزاجی پیدا ہوتی ہے۔'' ''عزم'' ''بیماری کی حالت میں نعیم کے خیالات نے پہلو بدلا۔ درد کی جگہ چہرہ پر عزمِ قوی کی جھلک نظر آئی، جیسے صاحب خانہ کی جھڑکیاں سُن کر سائل کے تیور بدل جاتے ہیں۔ نہیں، ہرگز نہیں، میں اپنے لختِ جگر کو، اپنی پیاری بیوی کو در بدر کی ٹھوکریں کھانے نہ دوں گا، اپنے خاندان کی عزّت و ناموس کو یوں برباد نہ ہونے دوں گا۔ میں نیم جاں ہوں، خستہ حال ہوں، لب گور ہوں، لیکن تقدیر کے سامنے سر نہ جھکاؤں گا۔ اس کا محکوم نہیں، حاکم بنوں گا، اس کی آستانہ بوسی نہ کروں گا، اسے اپنے پیروں پر جھکاؤں گا، اپنی کشتی کو پابوس نہ بننے دوں گا۔'' (خواب وخیال) نغمۂ رُوح ''آدھی رات، ندی کا کنارہ، آسمان کے ستارے ساکن تھے، ندی کے ستارے لہروں کے ساتھ رواں، ایک نغمۂ فردوس کی دل کش، رُوح پرور مستانہ صدائیں اس خاموش اور تاریک منظر پر اس طرح چھا رہی تھیں، جیسے دل پر اُمیدیں چھائی رہتی ہیں یا چہرہ پر غم'' ''ندی پار سے جو دل کش نغمہ آ رہا تھا۔ اُس شیریں راگ کی کشش نے ایک عالمِ محویت طاری کر دیا۔ شہزادی بے قرار ہوگئی جیسے پروانہ شمع کو دیکھ کر، آہ کتنا دل سوز نغمہ ہے؟ یہ نغمہ نہیں ہے، یہ اس فضائے وسیع کی نزہت ہے، یہ سارے پھولوں کی رُوح ہے۔ ساری شیرینیوں کا عطر، ساری حلاوتوں کا، ساری کیفیتوں کا خلاصہ ہے، اس کی نزاکت اور لطافت زیادہ روشن ہوگئی تھی، جیسے بتّی اُکسا دینے سے چراغ زیادہ روشن ہو جاتا ہے'' ''اُف کتنا معرفت انگیز راگ ہے، کتنا وجد میں لانے والا، اس نغمہ میں کوئل کی مستی ہے، پپیہے کا درد ہے، شاما کا گداز ہے، اس میں آبشاروں کا زیر ہے، طوفان کا بم ہے۔ جس سے قلب مرتعش ہوتا ہے، جس پھول کی یہ مہک ہے، جس چراغ کی یہ روشنی ہے اُس کا خالق کہیں قریب ہی بیٹھا ہے، بہت قریب۔ شہزادی کو معلوم ہوا گو یا وہ نغمۂ روح پرور کسی شمع روشن کی طرح نور برساتا ہوا میری طرف چلا آتا ہے۔ اُسے اپنے پہلو میں۔ ستارے جھلملاتے ہوئے دکھائی دے۔ اُس پر ایک بیخودی کا سُرور چھا گیا اور وہی مستانہ نغمہ، وہی دلکش راگ اُس کے منہ سے بھی نکلنے لگا۔ وہی آبِ حیات کی بوندیں اُس کے لبوں سے ٹپکنے لگیں'' (خاکِ پروانہ) پیکرِ وفا۔ ''کئی دن کی سخت مُسافت کے بعد جب وہ اُس مقام پر پہنچا تو شام ہوگئی تھی۔ وہاں بستی کا نام بھی نہ تھا۔ البتہ دو چار ٹوٹے پھوٹے جھونپڑے اُس بستی کے نشان کی صورت میں باقی رہ گئے تھے۔ وہ جھونپڑا جس میں کبھی محبت کا اُجالا تھا، جس میں اُنہوں نے زندگی کی مسرت بھری گھڑیاں کاٹی تھیں، جواُن کی تمناؤں کا مرکز تھا، اب اُن کے دل کی طرح ویران ہو گیا تھا۔ جھونپڑے کی ویرانی خاموش زبان میں اپنی رقت بھری داستان سنا رہی تھی۔ ''کنور'' اُسے دیکھتے ہی ''چندا'' پکارتا ہوا دوڑا۔ اُس نے وہاں کی خاک کو ماتھے پر لگایا۔ گویا کسی دیوتا کی بھبوت ہو، اور اس کی شکستہ دیواروں سے لپٹ کر بڑی دیر تک روتا رہا۔ اُس رونے میں بہشت کا سُرور تھا۔ کیا کل دُنیا کا سکھ ان آنسوؤں کی برابری کر سکتا ہے؟'' ''چندا'' بھی دُنیا سے یہی کہتی چلی گئی کہ ''کنور آتے ہوں گے'' (خواب وخیال)

(۵۱)



سید علی سجاد حیدر یلدرم

(۱۸۸۰-۱۹۴۳ء)

یلدرم ۱۸۸۰ء میں ضلع بجنور میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۰۱ء میں علی گڑھ سے بی اے پاس کیا۔ پھر ٹرکی میں سفیر بن کر گئے اور وہیں ترکی قلمی نام "یلدرم" (بمعنی بجلی) رکھا اور ترکی زبان کے چند شہ پاروں کو اُردو میں منتقل کیا۔ واپسی پر یو۔پی میں ڈپٹی کلکٹر اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے رجسٹرار رہے۔ ۱۹۴۳ء میں انتقال ہوا۔ سجاد حیدر یلدرم نے ایک خاص طرزِ تحریر کی بُنیاد ڈالی اور اُردو ادب میں ایک نیا تصوّر، ایک نیا اسلوب اور ایک نئی زندگی منتقل کی۔ اُن کے مضامین ہمیشہ اپنے رنگ میں نئے اور خیال میں اچھوتے ہوتے تھے۔ اُردو میں انشائے لطیف کے ماہر تھے۔ ان کی انشاء کی خصوصیت رعنائیِ خیال، لطافتِ بیان، شگفتگی اور نُدرت کے ساتھ ایک ایسا انداز ہے جسے نثر میں شاعری سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ یلدرم کے افسانے ادبیّت کا شاہکار ہیں اور اُن کے قلم کی نقاشی نے ایسے دلنواز نقش و نگار بنائے ہیں جن میں افکارِ لطیف کی ایک دنیا آباد ہے۔ جہاں کہیں وہ مناظرِ فطرت کا عکس اپنی رُوح کے آئینہ میں دیکھتے ہیں وہاں اُن کی تحریروں کا پڑھنے والا اُن کے وجدان کی موسیقی میں محو ہو کر رہ جاتا ہے۔ غرض یلدرم نے رومانیت کی روح کے ہزار ہا جلوؤں کو بے نقاب کیا ہے۔ یلدرم کے افسانے بحیثیتِ فن مکمل، بلحاظ پلاٹ دلچسپ، باعتبار اندازِ بیان جاذبِ نظر ہوتے ہیں۔ پریم چند اور سجاد حیدر کا مختصر افسانے میں جواب نہیں۔ "مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ" یلدرم کا مشہور شاہکار ہے۔ **خارستان وگلستان**۔ فضا میں خاموشی، بے پایاں سمندر، وحشت انگیز سکوت، کوئی صدا نہیں، کوئی اثرِ حیات نہیں، ایک غیر محدود مگر روشن تنہائی، ایک محشرِ سکون۔" "یہ عالم ہے! چاند خاموشی کے ساتھ گویا سوچ رہا ہے۔ موجیں سوچ رہی ہیں۔ چاند کی کرنوں کے سیلاب سے، بچا ہوا، شاید سوچ رہا ہے، بادلوں کے منتشر ٹکڑے سوچ رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہوا اس خاموشی کا بھید چپکے چپکے سمندر کے کان میں کہنا چاہتی ہے اور نہیں کہہ سکتی، سمندر کا سینہ سانس لینے کی کوشش کرنا چاہتا ہے۔ تمام موجودات میں گویا ایک کروٹ لینے کی خواہش معلوم ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس بے پایاں سُستی اور سکوت میں اگر کہیں سے ذرا سی صدا بھی آجائے تو دنیا ہنس پڑے گی اُچھل پڑے گی۔" حضرتِ دل کی سوانح عمری۔ "میری ملتجی آنکھوں کا اُن کی آنکھوں سے ملنا تھا کہ سینکڑوں ہزاروں تیروں کی پے در پے بوچھاڑ پڑنے لگی۔ مگر ان کو اس وقت عین اُس بوچھاڑ کے وقت بھی اپنی بے تقصیری پر اصرار تھا۔ ہم کچھ نہیں جانتے؟ کہا اور ہزاروں تیر برسادئے (خود ہی پوچھتے ہیں) تم اِس قدر زخمی کیوں نظر آتے ہو۔ کس نے گھائل کیا؟" اور ایک نظر، ایک ترحم انگیز۔ اور ہوش ربا نظر۔ ڈالی اور ایک لاکھ برچھیوں نے مجھے چھلنی کر دیا۔ "ہے ہے اس قدر نہ تڑپو۔ کس بے رحم نے تمہیں خون میں شرابور کر دیا؟ انہیں اپنے ظلموں کی خبر نہیں۔ تیروں کی بوچھاڑ عمداً نہیں کی جاتی، بلکہ اپنے آپ ہوتی رہتی ہے۔ اُف اُف خدا ان تیراندازوں سے پالا نہ ڈالے۔" "جہاں پھول کھلتے ہیں اور گلاب کی خوشبو شام کے سایہ میں پھیلتی ہے۔ ایسی وادی کے خاموش گوشہ میں جہاں نہ دبدبہ ہو، نہ دغدغہ زندگی بسر کرنے کا لطف ہے۔ جب پھول کھلتے ہیں اور یہ کثیف اور ترش رُو دنیا ہنسنے لگتی ہے ہوا میں حُسن و عشق سے مشابہہ آہنگ نرم ایک اسرار انگیز خفیف، روانی پیدا ہوتی ہے۔ جب فرشتہ گل، سُبو کے منہ کو کھولتا ہے اور بادلوں کو رنگین کرتا ہے۔ اس وقت بہار کے موسم میں ایک شام کو مر جانے کا لطف ہے۔" "یہ جزیرہ گو بے اِنتہا خوبصورت تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک گراں خواب میں سو رہا ہے اور ہمیشہ سے کسی چیز کا انتظار کر رہا ہے۔ خار اور نسرین کی پہلی مُلاقات پر تمام کلیاں ایک دم کھل گئیں۔ جزیرے کے پرندے چہچہا کر اُڑنے لگے۔ ایک گرد بادِ آہنگ و رنگ، ایک زمزمۂ جوش و خروش نے کل جزیرہ کو گھیر لیا۔ نسرین ہوش میں آئی تو دیکھا کہ ایک محبت کا پھول کھلا ہوا ہے۔" (خیالستان ۱۹۱۶ء)



کرشن چندر

(۱۹۱۲-۱۹۷۷ء)

کرشن چندر کی پیدائش ۱۹۱۲ء کی ہے۔ ۱۹۳۴ء میں لاہور سے ایم۔ اے کیا۔ خُود لکھتے ہیں۔ ''میری عمر کا بیشتر حصّہ کشمیر میں گزرا۔ کشمیر کی خوبصورتی اور غریبی سے متاثر ہوا ہوں اور اجتماعی طور پر خوبصورتی کو پا لینے اور غریبی کو کھو دینے ہی کو میں، انسانیت کے بنیادی مسائل سمجھتا ہوں۔'' کرشن چندر ایک کامیاب افسانہ نگار تھے۔ اُن کی تحریر میں، تخیّل میں، قوتِ تخلیق میں، رعنائی اور تازگی موجود ہے۔ اُن کا دل بہت حسّاس ہے۔ ان کی نظر اور ان کا دماغ زندگی کے ہر پہلو تک پہنچتا ہے۔ کرشن چندر نے اُردو افسانہ کو جس خوبصورتی اور فنّی کمالات سے آگے بڑھایا وہ قابلِ قدر ہے۔ افسانوں کے علاوہ ناول بھی لکھے ہیں جن میں ''شکست'' بہت مشہور ہے۔ لیکن کرشند چندر افسانہ نگار ہیں۔ ''کشتی۔ اُس کے حَسین چہرہ میں کچھ ایسی عجب کشش تھی جس نے مجھے ایک دم مسحور کر دیا۔ صرف ایک لمحہ کے لئے اُس نے میری طرف دیکھا۔ پھر وہ گھنی گھنی پلکیں اُس کے رُخساروں پر جھک گئیں، وہ کشمیر کے حُسنِ صبیح کا ایک نادر نمونہ تھی۔ دل کش خدوخال، سروقد و دلآویز رنگت، لیکن جس چیز نے مجھے زیادہ متاثر کیا وہ اُس کی ظاہری خوبصورتی سے بھی بڑھ کر اُس کی نگاہوں کا حُزن و ملال تھا جسے میں ایک جھلک ہی میں پا گیا۔ اُف وہ المناک گہرائیاں، اُس لمحہ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں بجلی کی سی سُرعت کے ساتھ کسی گہرے سمندر میں ڈوبا جا رہا ہوں کہ اتنے میں عبداللہ ملاح کی پُرسوز آواز نے میرے جذبات کی سمٹی ہوئی دنیا میں تلاطم پیدا کر دیا۔ میرا دل ایک عجیب لذّتِ درد کے مزے لینے لگا۔ یہ کیسی خلش تھی، ہلکی میٹھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نغمہ کی ہر لَے میں کسی مجبور حسینہ کی رُوح کھچی چلی آ رہی ہے یا دریائے جہلم کی وسیع چادرِ آب، ایک صحرا ہے جس میں ہماری کشتی ''ڈاچی'' (ناقہ) بنی ہوئی محبوب کی تلاش میں جا رہی ہے، رُوٹھے ہوئے محبوب کو منانے کے لئے ''ڈاچی'' کے اِس حُسین نغمہ نے (جسے گانے کے لئے سوز چاہئے ساز نہیں) لڑکی کے دل میں دبی ہوئی چنگاری کو روشن کر دیا تھا۔ نہیں تو آنسو کیسے؟ میرا دل اس بھید کو جاننے کے لئے بے تاب ہو گیا۔ سورج غروب ہو کر دریا میں ڈوب رہا تھا۔ دریا کی خاموش سطح پر ایک عجیب، نازک، نرالی، سحر طراز روشنی پھیل گئی تھی۔ یہ غروبِ آفتاب نہیں، نُمودِ سَحر ہے، مغرب نہیں، مشرق ہے، روشنی کا منبعِ اعظم، ہم غیر فانی انسان ہیں جو اِس کبھی نہ غرق ہونے والی کشتی پر سوار ہو کر اپنے محبوب سے ملنے جا رہے ہیں اپنے اَبدی محبوب سے، کنارہ آ گیا تو لڑکی نے میری طرف مبہم، خُمار آلود، اندوہگیں نگاہوں سے دیکھا۔ وہ نگاہیں شاید کُھل کر دل کا راز کہہ دینا چاہتی تھیں مگر کامیاب نہ ہو سکیں۔ ان آنکھوں میں ایک ہلکی سی چمک پیدا بھی ہوئی مگر پھر فوراً گم ہو گئی جیسے کوئی حسین سنگریزہ سمندر کے گہرے نیلے پانی میں کھو جائے'' **(طلسمِ خیال)** ''حسینہ۔ نازک لب، شرمسار و محجوب آنکھیں، جیسے وہ اپنی خوبصورتی پر خود ہی پشیمان ہو۔ نازک ہاتھ، مرمریں انگلیاں جنگلی گلاب کی کلیوں کی طرح حسین، اس کی چال جیسی دوشیزۂ بہار اپنی تمام تر لطافتوں اور رعنائیوں کو لئے ہوئے ہوا کے دوش پر اٹھلاتی ہوئی آ گئی ہو۔ آواز صنوبر کے جنگلوں میں گھومتے ہوئے گڈریے کی بنسری کی طرح میٹھی اور ٹھنڈے چشموں کے ترنّم کی طرح لوچدار، سروقد، چشمِ آہو۔ دُنیائے تہذیب سے بہت دُور، ایک خاموش جنگل میں، ایک پُراسرار وادی میں، وحشی، گمنام اور معصوم حسینہ چشمے کے کنارے اپنے خیالوں میں مَست بیٹھی تھی۔ اِس کی آنکھیں خوابیدہ سی ہو گئیں جیسے کوئی عجیب سپنا دیکھ رہی ہو۔'' غربت۔ ''دو عورتیں، ایک بوڑھی ایک جوان اُپلوں کا ٹوکرہ اٹھائے خچروں کی طرح ہانپتی ہوئی گزر رہی ہیں۔ جوان عورت کی چال تیز ہے۔ بیٹی ذرا ٹھہر تو، بوڑھی عورت نے کہا جس کے چہرے پر بے شُمار جھریاں ہیں، چال مدھم ہے اور لہجہ میں بیکسی ہے۔ بیٹی ذرا ٹھہر، میں تھک گئی میرے اللہ۔ اماں، ابھی گھر جا کر روٹی پکانی ہے۔ اچھا بیٹی، اچھا بیٹی! بوڑھی، جوان عورت کے پیچھے جا رہی ہے۔ بوجھ کے مارے اسکی ٹانگیں کانپ رہی ہیں، پاؤں ڈگمگا رہے ہیں، اُسکی جھریوں میں غم ہے او بھوک، فکر ہے اور غلامی اور صدیوں کی غلامی۔ (نظارے)

(۵۳)



آغا حشر

(۱۸۷۹-۱۹۳۵ء)

آغا محمد شاہ نام، حشر تخلص، آبائی وطن کشمیر تھا۔ ۱۸۷۹ء میں بنارس میں پیدا ہوئے۔ ان کی ڈرامہ نویسی کی ابتدا ۱۹۰۱ء میں بمبئی میں ہوئی۔ بعد میں کلکتہ چلے گئے۔ کیونکہ یہی دونوں مقام تھیٹریکل کمپنیوں کے مرکز تھے اور تھیٹر کا طوطی بول رہا تھا۔ جب تھیٹر کا بازار سرد پڑ گیا تو فلموں کے لئے آغا حشر نے ''یہودی کی لڑکی'' اور ''رستم وسہراب'' مشہور ڈرامے لکھے۔ چونکہ وہ شاعر بھی تھے، اس لئے اِن کے ڈرامے زبان وبیان کے اعتبار سے بھی اعلیٰ معیار کے ہوتے تھے۔ وہ اپنے کرداروں میں وفورِ جذبات خوب دکھاتے۔ ان کا عشق بہت گہرا اور اُن کے جذبات بہت عمیق ہوتے۔ وہ نظم اور نثر دونوں کے اُستاد تھے۔ حشر کی مکالمہ نگاری میں زورِ بیان معراج کمال پر ہوتا ہے۔ ان کو مکالمہ پیش کرنے میں کمال حاصل تھا۔ حشر نے اِس صنف کو زندہ رکھنے میں اپنا خُونِ جگر صرف کیا اور بے مثال ڈرامے تصنیف کئے جن میں فن کاری کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں۔

اسی لئے وہ اُردو ڈرامے کے محسنِ اعظم ہیں۔ آغا حشر ایک فاضل ادیب، شاعر، باا‌ثر مقرر اور مایۂ ناز تمثیل نگار تھے۔ ۱۹۳۵ء میں لاہور میں انتقال ہوا۔ ''گرد آفرید۔ (ایران کی ملکہ زخموں سے چُور ہے) تم، تم، آہ مرنا بھی مشکل ہوگیا (جوشِ محبت سے اٹھنے کی کوشش کرتی۔ اور گر پڑتی ہے) آؤ، سہراب آؤ، تمہیں دیکھ کر زندہ رہنے کی تمنا پیدا ہوگئی لیکن اب تمنا کا وقت نہیں رہا۔ زندگی ہمیشہ کے لئے رخصت ہورہی ہے۔'' ''میرے دل کے مالک''! میرے فرض نے مجھے مجبور کردیا تھا، وطن کا مرتبہ عشق سے بلند ہے اس لئے مجھے معاف کردو، موت کے دروازہ پر دُنیا کی دوستی اور دشمنی ختم ہوجاتی ہے۔ سہراب۔ آفرید میرا تو یہ خیال تھا کہ تم مجھے اپنی محبت کا حقدار نہیں سمجھتیں، اسی لئے اس قدر جوش کے ساتھ جنگ کر رہی ہو۔ گرد آفرید۔ آہ تمہیں کیا معلوم کہ فرض اور محبت کی جنگ میں میری رُوح نے کتنے عذاب برداشت کئے ہیں، صدمہ نہ کرو، دوست اور دشمن ہمنام ہیں، اس لئے تمہیں دھوکا ہوا۔ میں نے اپنے پیارے ''سُہراب'' سے نہیں اپنے ملک کے دشمن سے جنگ کی ہے۔ سہراب قسمت کا ستم دیکھو، محبت کے پیاسے کو تسلی کا آبِ حیات بھی پلا رہی ہے اور جُدائی کا زہر بھی (ڈرامہ رستم وسہراب) شہزادہ قیصر کو قزل قید خانہ میں بند کردیتا ہے اور گرم سلاخوں سے قیصر کی آنکھیں پھوڑتا ہے۔ قیصر۔ نہیں قزل، ان دو آنکھوں کے بچانے کیلئے دو زبانوں کی ضرورت ہے، اگر تمہاری مرضی ہو میری زبان کاٹ دو، مگر دونوں آنکھیں رہنے دو، دیکھو، دیکھو میری بے گناہ آنکھوں کو روتا ہوا دیکھ کر دہکتا ہوا لوہا بھی ٹھنڈا ہوگیا ہے۔ قزل۔ میں اسے پھر گرم کروں گا۔ قیصر۔ ادھر دیکھو آگ بھی دلگیری سے مرگئی۔ قزل۔ میں اسے پھونک کر زندہ کروں گا۔ قیصر۔ تم اسے زندہ کروگے وہ غصہ سے تم پر لال ہوجائے گی۔ اگر اس پر بھی تم نہ مانوگے تو وہ راکھ کا کفن پہن کر خاموش ہوجائے گی۔ افسوس! آگ اور لوہا جن کو تم بے رحم سمجھ کر ساتھ لائے تھے وہ بھی مجھ پر رحم کر رہے ہیں۔ قزل۔ قیصر تُو کیا چاہتا ہے؟ قیصر۔ رحم اور دو آنکھیں'' قزل۔ قیصر! آج تو نے مجھے رحم کرنا سکھادیا۔ اب اگر تیرا چچا تمام دنیا کا خزانہ بھی دیگا تو میں تیری آنکھوں پر سے نثار کردوں گا۔'' (صیدِ ہوس) شہزادی ڈیسیا۔ (شہزادہ مارکس کی منگیتر) راحیل مجھے شہزادے کی جان کی خیرات دو چاہے اُس کے بدلے میری جان لے لو۔ راحیل (یہودی کی لڑکی) ہا! یہ قدرت کا انتقام ہے، یہ عبرت کا مقام ہے کہ جو مغرور کسی کا سر ذلیل سمجھ کر ٹھکراتے ہیں وہی مجبور ہوکر ایک دن اُس کے پیروں پر سر جھکاتے ہیں، اچھا، اسکی جان بخشی کا انعام؟ ڈیسیا۔ منہ مانگا معاوضہ جو مانگو سولو، پر شہزادے کی جان بچالو۔ راحیل۔ نہیں، یہ ٹوٹا ہوا دل اور بھی چُور چُور کروں گی مگر تمہارا سخن کبھی منظور نہ کروں گی۔ ڈیسیا۔ تمہارے پاؤں پر سر جھکا رہی ہوں راحیل، جہنمی دیوتا بن کر نیک عورت کا نام نہ ہنساؤ۔ راحیل۔ نہیں نہیں، عورتوں کا نام نہیں ہنساؤں گی، شہزادے کی جان بچاؤں گی اور مَردوں کو یہ کہنے کا موقع نہیں دونگی کہ ایک رومن شہزادی نے سر جھکایا اور ایک مغرور یہودن نے رحم نہ کھایا۔ اُٹھو، شہزادی اُٹھو، میں تمہاری جفاؤں پر بھی وفا دکھاؤنگی۔ جب میرا جسم پاک، خاک میں مِل جائے اور بے وفا دنیا خودغرض بتائے اُس وقت تم پکار کر کہہ دینا کہ شکستہ دل ''راحیل'' اگرچہ یہودی تھی مگر سچی وفادار اور پیار کا سدا بہار گلشن تھی۔'' (یہودی کی لڑکی۔ ۱۹۲۷ء)



امتیاز علی تاج

(۱۹۰۰-۱۹۷۰ء)

سیّد امتیاز علی تاج ۱۹۰۰ء میں بمقام لاہور میں پیدا ہوئے۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔اے کیا۔ کالج کے ''ڈرامنگ کلب'' میں بہت دلچسپی لی۔ تصنیف وتالیف کا بہت اچھا ملکہ اور سلیقہ رکھتے تھے۔ تاج کا شاہکار ''انارکلی'' ہے۔ جو اُردو ادب کے ڈراموں کا ''تاج'' ہے اسی لئے اس ڈرامے پر اُردو زبان کو غزّہ وناز ہے۔ اس میں سلیم (جہانگیر) کی دل دوز ٹریجڈی اور اس کی دلربا کنیز ''انارکلی'' کا حسرت ناک انجام، معاشرت اور تمدن کے ہو بہو تصویریں اور شاہی قلعہ کی بول چال ہے انارکلی چاندباغ کی رعنائیوں میں کیف ومستی کی دلآویزیاں پیدا کر رہا ہے حوض کے ننھے ننھے فواروں کی آب افشانی حوض میں چاند کو گدگدا کر بیقرار کر رہی ہے (انارکلی حوض کے کنارے اکیلی گھٹنوں پر سر رکھے ہلکی ہلکی سسکیاں بھر رہی ہے۔ اِس کا ستار اُس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر سیڑھی پر گر پڑا ہے) تھوڑی دیر بعد سر اٹھاتی ہے اور رُخسار گھٹنوں پر رکھ لیتی ہے) ''سلیم! تمہیں کیا مل گیا، میری نیندوں کو لوٹ کر۔ میری راحت کو غارت کر کے تمہیں کیا مل گیا سلیم! پھر تم نے کیوں محبت کے پیغام بھیجے۔ کیوں سُلگتی ہوئی چنگاری کو دہکایا! یہ ہنسی تھی؟ یہ سب ہنسی ہی تھی۔ مگر عالی مرتبت شہزادے! کمزور، بے بس کنیز سے ہنسی! اس قیامت کی ہنسی! اُس نے تمہارا کیا بگاڑا تھا (پھر گھٹنوں پر سر رکھ کر سسکیاں بھرنے لگتی ہے) سلیم (آہستہ سے انارکلی، انارکلی (چونک کر سہم جاتی ہے) کون؟ سلیم۔ انارکلی سلیم کو دیکھ کر خوف اور پریشانی کے عالم میں کھڑی ہو جاتی۔ سلیم (قریب آکر) تم کھڑی ہو گئیں انارکلی! یہاں بھی شہنشاہ کا آہنی قانون؟ ہم تو تاروں بھرے آسمان کے نیچے کھڑے ہیں یہاں کا قانون دوسرا ہے۔ بہت مختلف (انارکلی کا ہاتھ پکڑ کر اسے بٹھا دیتا ہے۔ سلیم خود کھڑا رہتا ہے) انارکلی کھوئی ہوئی بیٹھی ہے اور نیم بے ہوشی کی سی کیفیت ہے۔ سلیم۔ تم نہیں جانتیں، تم نے کیا کر دیا۔ میں خود بھی نہیں جانتا۔ سب نہیں جانتا انارکلی (تامل کے بعد) تم نے میری تمام آسائشوں، تمام راحتوں کو اپنی ہستی میں سمیٹ لیا۔ تم نے میری تمام کائنات کا رس چُوس لیا۔ اے نازنین تم ایک معجزے کی طرح میرے سامنے آئیں اور میری آرزوں کی نیند ٹوٹ گئی، تم نے اپنی حیران نظروں سے مجھ کو دیکھا اور میری رُوح میں لامتناہی محبت کے شعلے بھڑک اُٹھے۔ تم چلی گئیں اور میری تمام دنیا تمہاری آرزو میں دھڑکتی رہ گئی (انارکلی سر جھکا لیتی ہے اور خاموش رہتی ہے) تم چپ ہو انارکلی! میں جانتا ہوں مجھ کو نہ آنا چاہئے تھا، مگر بے بس پروانے کا کیا قصور؟ (انارکلی کے چہرے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ سُن رہی ہے اس سے اُسے تکلیف پہنچ رہی ہے لیکن اُس کی زبان اب بھی بند ہے) انارکلی (چھنگلی سے گوشۂ چشم کا آنسو پونچھتی ہے) ہندوستان کا نیا چاند ایک چکور کو چاہتا ہے؟ کیسی ہنسی کی بات! آہ تم شہزادے ہو! بہت بڑے۔ میں ایک کنیز ہوں، ناچیز، بیحد ناچیز، شہزادہ کنیز کو چاہے گا؟ کیسی ہنسی کی بات! سلیم (ایک لمحہ متامل رہ کر) اب بھی تیرے دل میں شُبہ موجود ہے تو اے انارکلی! اے اس دل کی ملکہ! لے ہندوستان کو اپنے قدموں میں دیکھ (سلیم گھٹنوں کے بل ہو کر انارکی کا ہاتھ تھام لیتا ہے اور فرطِ محبت سے اُسے چومتا ہے) انارکلی۔ آہ! آہ! (بیتاب ہو کر کھڑی ہو جاتی ہے)۔ سلیم (اٹھتے ہوئے) انارکلی! میری اپنی انارکلی! تو میری ہے صرف میری ہے۔ انارکلی۔ اس کا انجام تباہی ہے۔ شہزادے! جاؤ! بھول جاؤ۔ سلیم (انجام مجھ سے پوچھو انارکلی۔ انارکلی! آہ ٹھہرو۔ سنو! (آواز پر کان لگا دیتی ہے، آخر بیتابی سے) کوئی ہے شہزادے کوئی ہے۔ جاؤ تم چلے جاؤ۔ آہ! تم نہیں جانتے۔ تم نہیں جان سکتے۔ تم شہزادے ہو۔ تم تک شُبہ کی نظریں نہیں پہنچ سکتیں۔ انارکلی کنیز ہے۔ صرف وہم اس کو مروا ڈالنے کو کافی ہے۔ سلیم۔ تمہارے بغیر نہیں جی سکتا۔ نہیں جی سکتا انارکلی! اگر سلیم مغلیہ ہند کا بادشاہ بنا تو تو اُس کی ملکہ ہوگی۔ اگر تو نہیں، وہ بھی نہیں۔ میری انارکلی! میری اپنی انارکلی! دلآرام۔ ہندوستان کے آئندہ بادشاہ کو اپنی ملکہ مبارک ہو، (انارکلی چونک کر دلآرام کو دیکھتی ہے اور بے ہوش ہو کر سلیم کے بازوؤں میں گر پڑتی ہے) (ڈرامہ انارکلی ۱۹۳۲ء)



سیّد احمد دہلوی

(۱۹۴۰-۱۹۱۸ء)

آپ ۱۸۴۶ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ وہیں تعلیم حاصل کی ۱۸۶۸ء سے اُردو لغت کی ترتیب شروع کی اور ۱۸۷۸ء میں اس کا ایک حصّہ ''ارمغان دہلی'' کے نا سے شائع کیا۔ ڈاکٹر فیلن (انسپکٹر مدارس صوبہ بہار) کو اپنی انگریزی اُردو ڈکشنری کے لئے ایک ماہر زبان کی ضرورت تھی۔ انہوں نے سیّد احمد دہلوی کو منتخب کیا۔ سیّد احمد نے سات سال تک اُن کے ساتھ کام کیا، اور پچیس سال کی مسلسل محنت کے بعد ۱۸۹۲ء میں لُغت مکمل کی جو شمس العلماء سیّد علی بلگرامی کی سفارش پر نظام دکن نے شائع کرائی اور انہی کے نام پر ''فرہنگ آصفیہ'' نام رکھا گیا۔ سیّد احمد دہلوی کا سب سے بڑا کارنامہ یہی اُردو لغت ہے۔ اُردو زبان میں ''فرہنگ آصفیہ'' سے پہلے اتنی مکمل اور مستند کوئی لغت موجود نہ تھی۔ انہوں نے سب سے پہلے اُردو لُغت چار ضخیم جلدوں میں مکمل کی اور اُسی سے اِن کا نام زندہ ہے۔ سیّد احمد نے دہلی کی ٹکسالی زبان لکھی ہے۔ محاورے برمحل، فقرے برجستہ، عبارت سُجھی ہوئی، مضمون واضح اور مدلّل۔ ۱۹۱۸ء میں دہلی میں وفات پائی۔ سبب تالیف۔ ''خدائے تعالیٰ نے عشق کا عمر پٹہ صرف ''حُسن'' ہی کے نام نہیں لکھ دیا ہے، بلکہ حُسن پرستوں سے گزر کر بہت سی باتوں کو انسان کی آب وگل میں بھر دیا ہے۔ ہمارے عشق نے ہم کو گلیوں میں پھرایا۔ ہر قسم کی صحبتوں میں بٹھایا۔ جگہ جگہ کے تنکوں کی بجائے فقرے چُنے۔ اپنی گرہ کا لگا کر دوسرے کی ڈب میں ہاتھ ڈالا۔ جو کچھ نکل سکا نکالا اور جو کچھ کمایا اور جس طرح جو کچھ ہاتھ لگا وہ اس دلبر بے جان کی نذر کر دیا۔ اُمید وصال نے یہ طول کھینچا کہ ہمارا ہی وصال نظر آنے لگا۔ مگر سخت جانی کا خدا بھلا کرے کہ اُس نے ہماری جان بچالی۔ اس اثنا میں ساتھ ہی یہ تجربہ حاصل ہوا کہ اِس دنیا میں کوئی کام عشق کے بغیر انجام کو نہیں پہنچ سکتا۔'' **محاکمہ زبانِ اُردو ۱۹۱۱ء** (یعنی اُردو زبان پر ایک تحقیقی مقالہ) وجاہت حُسین جھنجھانوی ایڈیٹر رسالہ ''اصلاحِ سخن'' نے دہلی کے بعض محاوروں پر اعتراض کر کے دہلی کو مرکز تسلیم کرنے سے انکار کیا تھا۔ سیّد احمد دہلوی نے ''**محاکمہ زبانِ اُردو**'' کتابی صورت میں شائع کیا اور اُن کے اعتراضات کے جواب دیے۔ دہلی کی مرکزیت کے سلسلہ میں دہلی و لکھنؤ کے محاوروں کا فرق، اس کی مثالیں اور لطیفے، اُردو زبان کی مختصر تاریخ اور لکھنؤ کے مُصنفوں اور انکی تصانیف کا ذکر اور بہت سی دلچسپ باتیں دورانِ کلام میں آگئی ہیں۔ وجاہت حُسین لکھتے ہیں۔ ''انگارے کو ابھی دِلّی والے پھول ہی سمجھے بیٹھے ہیں ان کو انگارے کی تعریف بھی معلوم نہیں۔ کیا انگارا اڑ کر جا سکتا ہے۔ کیا انگارا اُڑ سکتا ہے؟ سید احمد دہلوی جواب دیتے ہیں۔ ''اگر آپ ان الفاظ کے محل موقع سے واقف ہوتے تو اِس جگہ ''چنگاری یا شرارہ یا آگ کا پتنگا'' تحریر فرماتے۔ دیکھئے اہل زبان اور مقلد زبان میں کس قدر فرق ظاہر ہوا ہے۔ اب دوسری طرح اس کا جواب ملاحظہ فرمائیے۔ جب کوئلے جلتے وقت پھٹتے ہیں تو انکو آپ کیا فرمائینگے۔ کیا اُنکے روشن ذرّوں کو پھول یا چنگاری یا پتنگے سے تعبیر نہیں کریں گے؟ کبھی آپ نے چراغ کو بھڑکتے ہوئے دیکھا ہوگا تو اُس وقت جو روشن پتنگا سا یا اسکی جلتی ہوئی ٹیم نیچے گرتی ہے تو اُسے بھی پھول کہتے ہیں یا نہیں؟ کیا تو اجس وقت جگمگ جگمگ کرتا ہے تو اُسے تو اہنسا کسی وجہ سے کہتے ہیں یا نہیں؟ آتشبازی کے پھول تو آپ نے ضرور سنے ہونگے، اُن کو انگارا کیوں نہیں کہا۔ پھلجڑی اَنار وغیرہ آتشبازی میں نظرِ اقدس سے گزرے ہونگے، اُن میں سے انگارے اچھلتے ہیں یا پھول نکلتے ہیں؟ تیسری مثال اور لیجئے۔ ''منہ سے پھول جھڑنا، منہ نہ ہوا کسی باغ کا گل یا گلزار وجاہت ہوا۔'' آنکھ۔ نرگسی آنکھ، ڈورے دار آنکھ۔'' وہ آنکھ جس میں سُرخ رگیں دکھائی دیں۔ ''رس بھری آنکھ۔'' وہ آنکھ جس میں رس ٹپکتا ہو، یعنی محبت خیز اور عشق انگیز آنکھ۔ ''گلابی آنکھ۔'' ع خوب وہ آنکھ نشہ میں جو گلابی ہو جائے'' (فرہنگ آصفیہ)



سجاد حُسین

(۱۸۵۶-۱۹۱۵ء)

سجاد حسین کی پیدائش ۱۸۵۶ء میں ہوئی تھی۔ تعلیم ایف۔ اے۔ ۱۸۷۷ء میں اپنا مشہور اخبار ''اودھ پنچ'' لکھنؤ سے جاری کیا۔ زندہ دلی اُن کی گھٹی میں پڑی تھی۔ یہ اُن کی خوش قسمتی تھی کہ انہیں اکبر الہ آبادی، نواب آزاد[۱] ظریف اور رتن ناتھ سرشار جیسے زندہ دِل، سحر بیان اور جادُو قلم نامہ نگار ملے۔ جنھوں نے ''اودھ پنچ'' کو چار چاند لگا دئے۔ سجاد حُسین کی تحریر کا ایک خاص انداز تھا جس میں واقفیت اور معلومات کے ساتھ لطائف وظرائف بکثرت ہوتے تھے، اُن کی تحریر میں بے باکی اور آزادیِ خیال حد سے زیادہ تھی، جو کہتے تھے ہانکے پکارے کہتے تھے۔ سجاد حُسین نے ظریفانہ ناول کی بُنیاد ڈالی۔ اُن کے ناولوں میں جدّت طرازی بھی ہے اور ظرافت نگاری بھی۔ ''حاجی بغلول'' اُن کا شاہکار ناول ہے۔ ۱۹۱۵ء میں لکھنؤ میں وفات پائی۔ مدفن کاکوری ہے۔ ''حاجی بغلول بمبئی تک کے حاجی تھے۔ نیچر نے اِن کی صُورت بنانے میں خاص توجہ مبذول رکھی تھی۔ مثل اور لوگوں کے آپ کی تعمیر ٹھیکیدار کے سُپرد نہ تھی، بلکہ دستِ خاص کی صنعت تھی۔ بازو اور ہاتھ دُبلے، شانے ڈھلے، انگلیاں لکھنؤ کی مہین ککڑیاں، ٹانگیں چھوٹی موٹی، پوقدمی چال، مگر بروقتِ غیظ وغضب، جامہ نیلین سے باہر، نیلی پیلی آنکھیں، بحرِ احمر کی مچھلیاں، داڑھی کے بال وَہیل کی مُونچھیں، چہرہ آفتاب، ملکِ عرب کی طرح تمتمایا ہوا، منہ پر بحرِ ظلمات کی طرح کفِ بے پایاں، مزاج میں مدّ وجزر کی بلا خیزی، جریبِ زیتونی لے کر جھپٹ پڑتے۔ آپ جانتے ہیں اس طرح مجسم ظرافت، قدوم میمنت الزوم سے پبلک جلسے اور خوش مزاجوں کے پرائیویٹ مجمعے کیونکر خالی رہ سکتے تھے۔ بڑا ہی بے ضابطہ وہ جلسہ ہوتا جہاں حضرت رونق افروز نہ ہوتے اور انتہا کی پھیکی، بے مزہ وہ محفل شمار کی جاتی جس میں آپ اپنی مضحک صُورت وسیرت سے چہل پہل پیدا نہ کرتے۔'' ''راز ونیاز کے خطوط، کیسی ہی احتیاط سے کیوں نہ بند ہوں، ضرور تاڑ لئے جاتے ہیں، وہ اُن کا وزن، وہ چاروں طرف سے نئی نویلی دُلہن کی طرح سمٹا سمٹایا، ٹھساٹھس بند، وہ گوند کی چار چار تہیں، وہ لمبے چوڑے مضامین، ارمانوں، آرزوؤں، حسرتوں کے جم غفیر سے، چُست اور تنگ لفافے کے گوشے، وہ اعلیٰ درجے کا کاغذ، وہ انتہا کی خوش خطی، وہ خوشبوؤں میں بسا ہوا، وہ بند کرنے کی جگہ پر اکثر پان کی ہلکی سُرخی، یہ سب محبت، اُلفت، شکوہ وشکایت کے راز بتاتے، لب اور پان خوردہ کی شیرینی ظاہر کرتے ہیں۔ مشاق اور نظرباز ''خط کا مضمون تاڑ لیتے ہیں لفافہ دیکھ کر۔'' ''بنام ملکہ وکٹوریہ'' ''قیصر ہند'' ''معاملاتِ ہندوستان تمہاری خاص توجہ کے محتاج ہیں اور میری رائے میں تم بھی اس کی۔ آج تک تمہارے ملک اور پارلیمنٹ میں جس قدر توجہ ہوئی ہے، وہ بانس ناکافی ہے اور لاپروائی سے مملو۔ تمہاری قوم بڑی خود غرض اور خود مطلب ہے۔ یہ سمجھ لو کہ آزادگی اور شوریدگی، قوم کی دست بُرد سے اعزازِ قیصری محفوظ رکھنے کا صندوقچہ ہندوستان ہی ہے۔ اگر تنکا ہوا کا رُخ بتاتا ہے تو ایک شہزادے کی تنخواہ کے بارے میں قوم کی خِست بہت کچھ سمجھاتی ہے۔ یہ اسی ہندوستان کے جگرے ہیں جو بادشاہوں کا تقدس تک چاہتا ہے۔'' (اودھ پنچ ۱۸۸۸ء)

---

[۱] نواب آزاد کی ڈکشنری۔ پالیسی۔ گیدڑ بھبکی، ہوائی بندوق کی آواز، کمزور کو دبانا، زبردست سے ڈرنا، کسی کے جلتے ہوئے گھر سے تاپنا۔ پارلیمنٹ۔ تمدّن کے دنگل میں حکمتِ عملی کے مُطابق وزراء کے چت پٹ ہوجانے کا سہارا۔ انٹرسٹ (حقوق) وہ چیز جس کی حفاظت ضروری نہیں۔ ایک قسم کی تمدّن کی مچھلی جو کبھی جال میں نہیں پھنستی۔ سویلیزیشن (تہذیب) اپنے ہم وطنوں کو نیم وحشی جاننا)



مرزا فرحت اللہ بیگ

(۱۸۸۴-۱۹۴۵ء)

مرزا بیگ ۱۸۸۴ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۰۵ میں سینٹ اسٹیفنز کالج دہلی سے بی۔ اے کر کے حیدر آباد دکن میں ملازم ہوگئے۔ جب ریٹائر ہوئے تو اسسٹنٹ ہوم سیکرٹری تھے۔ وہیں ۱۹۴۶ء میں انتقال ہوا۔ فرحت اللہ بیگ کی زبان دِلی کی ٹکسالی زبان ہے۔ شوخی اور سنجیدہ طنز و ظرافت ان کی انشا کا طرۂ امتیاز ہے بیان کی سادگی اور زبان کا لوچ اِن کی ظرافت میں چار چاند لگا دیتا ہے۔ اسی لئے مزاح نگاری میں انہیں ایک خاص امتیاز حاصل ہے۔ مشاہیر کی قلمی تصویر کھینچنے میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ اپنے استاد ''مولوی نذیر احمد کی کہانی اپنی زبانی'' ان کا غیر فانی شاہکار ہے۔ ''مولانا عبدالماجد دریابادی فرماتے ہیں۔ ''فرحت اللہ بیگ کی زبان نرم و نازک تھی جیسے ریشم، لطیف تھی جیسے ہلکی ہلکی شبنم، سبک تھی جیسے پھول کی کلی، شیریں تھی جیسے مصری کی ڈلی' حُسن و عشق کے کھیل کھیلتے لیکن بازاریت کے قریب جب بھی نہ گزرتے، ہنسی، چہل، مزاح اور دل لگی کی چیز مہیا رکھتے، لیکن ابتذال کا سایہ بھی نہ پڑنے دیتے، ہنساتے، گدگداتے، کبھی کبھی چٹکی بھی لے لیتے، لیکن ظرافت اور تمسخر کی درمیانی حدوں کو کہیں بھی نظر سے اوجھل نہ پڑنے دیتے۔'' اب فرحت اللہ بیگ کہتے ہیں۔ ''زندگی کے بس دو ہی پہلو ہیں، زندہ دلی اور مُردہ دلی، ایک وہ لوگ ہیں جو مصیبت میں بھی ہنستے ہیں۔ دُوسرے وہ لوگ ہیں جو خوشی میں بھی روتے ہیں۔ ایک مرنے کو جینا سمجھتے ہیں، دوسرے جینے کو مرنا۔ زندگی کے ان ہی دونوں پہلوؤں نے کبھی مذہب کی شکل اختیار کی اور کبھی فلسفے کے مکتبوں کی صورت، غرض دُنیا بھر کے انسانوں کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک رونی صورت، دوسری ہنسنی مورت، کوئی اِنشا بنا، کوئی میرؔ۔'' وصیت کی تعمیل۔ ''کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بڑے میاں بھیڑ کو چیرتے پھاڑتے، بڑے بڑے ڈگ بھرتے میری طرف آ رہے ہیں، متوسط قد، بڑی سی توند، کالی سیاہ فام رنگت، چھوٹی سی گول ڈاڑھی، آئے اور آتے ہی مجھے گلے لگا لیا۔ جب اُن کی اور میری ہڈیاں پسلیاں گلے ملتے ملتے، تھک کر چُور ہو گئیں تو فرمایا'' ''میاں فرحت'' مجھے تم سے ملنے کا بڑا شوق تھا۔ بھئی مجھے نذیر احمد کی قسمت پر بڑا رشک آتا ہے کہ تم جیسا شاگرد اُس کو ملا۔ مرنے کے بعد بھی اُس کا نام زندہ کر دیا۔ افسوس ہے، ہم کو کوئی ایسا شاگرد نہیں ملتا جو مرنے کے بعد اسی رنگ میں ہمارا حال بھی لکھتا۔'' میں نے کہا ''مولوی صاحب آپ گھبراتے کیوں ہیں بسم اللہ کیجئے، مرجایئے، مضمون میں لکھ دوں گا۔'' کیا خبر تھی کہ سال بھر کے اندر ہی اندر مولوی صاحب (وحید الدین سلیم) مرجائیں گے اور مجھے ان کی وصیّت کو پورا کرنا پڑیگا اور پھر آج کل کا مرنا بھی کچھ عجیب مرنا ہو گیا ہے، پہلے زندگی کو چراغ سے تشبیہ دیتے تھے، بتّی جلتی، تیل خرچ ہوتا۔ تیل ختم'' ہونے کے بعد چراغ جھلملاتا، ٹمٹماتا، لَو بیٹھنی شروع ہوتی اور آخر رفتہ رفتہ ٹھنڈا ہو جاتا۔ اب چراغ کی جگہ ''زندگی'' بجلی کا لیمپ ہو گئی ہے اِدھر بٹن دبا، اُدھر اندھیرا گھُپ'' '''مولانا کے گھر کا نقشہ اِس وقت آنکھوں میں پھر گیا، برآمدہ میں ایک بان کی چارپائی پڑی ہے، دو تین تختے جڑی ٹوٹی پھوٹی کرسیاں ہیں، اندر ایک ذرا سی دری بچھی ہے اُس پر میلی چاندنی ہے۔ دو چار چوہا چکٹ تکیے، اور ایک سڑی ہوئی رضائی رکھی ہے۔ سامنے دیوار کی الماری میں پانچ چھ گُند اٹوٹی چائے کی پیالیاں، کنارے جھڑی رکابیاں، کھونٹیوں پر دو تین شیروانیاں، دو تین ٹوپیاں لٹک رہی ہیں، نیچے دو تین کھڑنگ جُوتیوں کے جوڑے پڑے ہیں۔ اِن کی بان کی چارپائی بھی نمائش میں رکھنے کے قابل تھی۔ ننگی پیٹھ اس پر اتنا لوٹے تھے کہ بان صاف اور چمکدار ہو کر اطلس ہو گیا تھا، اَوداِن کھینچتے تھے اور ایسی کھینچتے تھے کہ ہاتھ مارو تو طبلہ کی آواز دے۔ اب کھانے کی سنیے۔ سارے دن چائے بنائی۔ پی لی، اور بان کی کھری چارپائی پر لوٹ ماری، چلو زندگی کا ایک دن کٹ گیا۔'' (مضامین فرحت ۱۹۲۸ء)



پطرس بخاری

(۱۸۹۸-۱۹۵۸ء)

سیّد احمد شاہ بخاری پطرس ۱۸۹۸ء میں پشاور میں پیدا ہوئے۔ گورنمنٹ کالج لاہور اور کیمبرج میں تعلیم پائی۔ پھر گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی کے اُستاد مقرر ہوئے۔ اور یہیں پرنسپل ہوگئے۔ اس کے بعد آل انڈیا ریڈیو دہلی میں ڈائرکٹر جنرل براڈ کاسٹنگ رہے۔ ۱۹۵۰ میں انجمن اقوامِ متحدہ میں پاکستان کے مستقل نمائندے مقرر ہوئے۔ بعد میں انجمن اقوام متحدہ کے سیکریٹیٹ میں انڈر سیکرٹری (اطلاعات) کا عہدہ ملا۔ ۱۹۵۸ء میں امریکہ میں انتقال ہوا۔ پطرس نامور ادیب، انشاپرداز اور مزاح نگار تھے۔ انہوں نے اپنے مضامین میں اُن تمام لطافتوں کا اظہار کیا ہے جو ہمیں مغرب میں نظر آتی ہیں۔ اس طرح پطرس نے اُردو مزاح نگاری کے چمنستان میں نئے نئے گل بوٹوں کا اضافہ کیا۔ چنانچہ ''پطرس کے مضامین'' میں اعلیٰ درجہ کے طنز و مزاح کی چاشنی اور تازگی ہے۔ وہ بلاشبہ اپنے زمانے کے ممتاز مزاح نگار تھے۔ ''کُتّا کہتے ہیں کتا وفادار جانور ہے۔ اب جناب اگر وفاداری اِسی کا نام ہے کہ شام کے سات بجے جو بھونکنا شروع کیا تو لگاتار بغیر دم لئے صبح کے چھ بجے تک بھونکتے چلے گئے تو ہم لنڈورے ہی بھلے۔ کل ہی کی بات ہے کہ رات کے کوئی گیارہ بجے ایک کتے کی طبیعت جو گدگدائی تو اُنہوں نے باہر سڑک پر آکر ''طرح'' کا ایک مصرع دے دیا۔ ایک آدھ منٹ کے بعد سامنے کے بنگلے میں سے ایک کتے نے مطلع عرض کر دیا۔ اب جناب ایک کہنہ مشق استاد کو جو غصہ آیا، ایک حلوائی کے چُولہے میں سے باہر لپکے اور بھنا کے پوری طرحی غزل مقطع تک کہہ گئے۔ اس پر ایک قدرشناس کتے نے زوروں کی داد دی۔ اب تو حضرت وہ مشاعرہ گرم ہوا کہ کچھ نہ پوچھئے۔ کم بخت بعض تو دو غزلے، سہ غزلے لکھ لائے تھے۔ کئی ایک نے فی البدیہہ قصیدے کے قصیدے پڑھ ڈالے۔ وہ ہنگامہ ہوا کہ ٹھنڈا ہونے میں نہ آتا تھا'' ''سینما کا ٹکٹ لے کر اندر داخل ہوا۔ اندھیرا گھُپ، بہتیرا آنکھیں جھپکاتا ہوں کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ ادھر سے کوئی آواز دیتا ہے ''دروازہ بند کر دو جی۔'' ''یا اللہ جاؤں کہاں۔ رستہ، کرسی، تھوڑی دیر کے بعد تاریکی میں کچھ دُھندلے سے نقش دکھائی دیتے ہیں۔ جہاں ذرا تاریک سا دھبہ دکھائی دے جائے وہاں سمجھتا ہوں کرسی خالی ہوگی۔ خمیدہ پشت ہو کر اُدھر کا رُخ کرتا ہوں اس کے پاؤں کو پھاند، اُس کے ٹخنوں کو ٹھکرا، خواتین سے دامن بچا کر آخر کسی کی گود میں جا بیٹھتا ہوں، وہاں سے نکال دیا جاتا ہوں اور لوگوں کے دھکوں کی مدد سے کسی خالی کرسی پر جا بیٹھتا ہوں'' ''گیدڑ کی جب موت آتی ہے تو شہر کی طرف بھاگتا ہے۔ ہماری جو شامت آئی تو ایک دن اپنے پڑوسی سے بر سبیل تذکرہ کہہ بیٹھے کہ امتحان کے دن قریب آتے جاتے ہیں۔ آپ سحر خیز ہیں، ذرا ہمیں بھی جگا دیا کیجئے۔ دوسرے دن انہوں نے اُٹھتے ہی ہمارے دروازے پر مُگّا بازی شروع کر دی۔ کچھ دیر تک تو ہم سمجھے کہ عالمِ خواب ہے، لیکن یہ گولہ باری لحظہ بہ لحظہ تیز ہوتی گئی اور جب کمرے کی چوبی دیواریں لرزنے لگیں، صراحی پر رکھا ہوا گلاس جلترنگ کی طرح بجنے لگا اور دیوار پر لٹکا ہوا کلنڈر رپنڈولم کی طرح ہلنے لگا تو بیداری کا قائل ہونا پڑا۔ میں کیا میرے آباواجداد کی رُوحیں اور میری قسمتِ خوابیدہ تک جاگ اٹھی ہوگی'' ''بائیسکل۔ جب اُتار پر میری بائیسکل ذرا زیادہ تیز ہوئی تو فضا میں ایک بھونچال سا آگیا اور بائیسکل کے کئی اور پُرزے جواب تک سو رہے تھے، بیدار ہو کر گویا ہوئے۔ اِدھر اُدھر کے لوگ چونکے۔ ماؤں نے اپنے بچوں کو سینوں سے لگا لیا۔ اِس قدر تیز رفتاری بائیسکل کی طبع نازک پر گراں گزری۔ چنانچہ اُس میں یک لخت دو تبدیلیاں واقع ہوگئیں۔ ایک تو ہینڈل ایک طرف کو مڑ گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں جا تو سامنے کو رہا تھا۔ لیکن میرا جسم دائیں طرف کو مُڑا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ بائیسکل کی گدی دفعتہً چھ انچ کے قریب نیچے بیٹھ گئی۔ چنانچہ جب پیڈل چلانے کیلئے ٹانگیں اوپر نیچے کر رہا تھا تو میرے گھٹنے میری ٹھوڑی تک پہنچ جاتے تھے، کمر دُہری ہو کر باہر کو نکلی ہوئی تھی۔ پہیوں کی اٹکھیلیوں کی وجہ سے سر برابر جھٹکے کھا رہا تھا۔ پطرس نے اپنے مزاح کے ذریعے جہاں اردو والوں کو خوشی بخشی وہیں بقول رشید احمد صدیقی کے انھوں نے اردو ادب کو نئی روح اور تازگی بھی بخشی۔



برج نرائن چکبستؔ

(۱۸۸۲-۱۹۲۶ء)

پنڈت برج نرائن چکبستؔ ۱۸۸۲ء میں فیض آباد میں پیدا ہوئے اِن کے بزرگ کشمیر سے آئے تھے۔ چکبستؔ نے ۱۹۰۵ء میں لکھنؤ سے بی۔اے کیا۔ پھر قانون کے امتحان میں کامیاب ہوکر وہیں وکالت شروع کردی۔ ۱۹۲۶ء میں وفات پائی۔ چکبستؔ نے نیچرل شاعری میں نازک خیالی، شاعرانہ لطافت اور قومی جذبات کے ایسے جوہر دکھائے جو آج تک دل پر نقش ہیں۔ ان کی حُب الوطنی نے اُردو ادب میں اپنے لئے وہ جگہ پیدا کی جو کسی شاعر و ادیب کو میسّر نہ ہوئی۔ چکبستؔ مایۂ ناز شاعر، کامل انشا پرداز اور بالغ نظر نقاد تھے۔ ان کی تنقید بھی رنگین و دلچسپ تھی۔ مثنوی میر حسنؔ اور مثنوی گلزارِ نسیم پر چکبستؔ اور مولانا شررؔ کے مابین تحریری مباحثہ مدتوں رہا لیکن چکبستؔ نے زورِ استدلال کے باوجود کہیں تلخی نہیں آنے دی اور آخر تک سچا تنقیدی وقار قائم رکھا۔ اس سے چکبستؔ کی تحقیقِ علمی کا پتہ چلتا ہے۔ بعد میں ''معرکۂ چکبست و شرر'' کے نام سے یہی مضامین شائع ہوگئے۔ ''صبحِ وطن'' (کلام مجموعہ) اور ''مضامین چکبست'' اِن کی یادگار ہیں۔ چکبستؔ نے جو تصورات چھوڑے ہیں وہ ہماری ادبی اور قومی زندگی کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ حُب الوطنی۔ ''ہمارے عزیزانِ وطن نے جب غیر قوم (انگریز) کی اطاعت قبول کی تو ظاہری پابندیوں سے، بہت زیادہ قابلِ عبرت خیالات کی غلامی تھی جس نے غیر قوم کی حکومت کا سکّہ ہمارے دل میں و دماغ پر جاری کردیا۔ ہمارے جذبات و خیالات مغربی تہذیب کے مصنوعی اور نمائشی رنگ میں گرفتار ہوگئے اور ہم اپنے قومی حفظِ مراتب سے بے خبر ہوگئے۔ میں اِس خیالات کی غلامی کے سلسلے کو سونے کی زنجیر کہوں گا جسے ہم نے خوشی سے پہن لیا اور اپنی گرفتاری پر ناز کرنے لگے۔ اِس دماغی اور رُوحانی غلامی نے طبیعتوں کا رنگ کچھ ایسا پلٹ دیا کہ ہم حکمران قوم کے انداز معاشرت کی تقلید کو تہذیب و تربیت کا جوہر سمجھنے لگے اور قومی وقار کا سودا ہمارے سر سے رخصت ہوگیا۔

زباں کو بند کریں یا مجھے اسیر کریں   میرے خیال کو بیڑی پہنا نہیں سکتے

(چکبستؔ) گلزارِ نسیم۔ مثنوی میر حسنؔ کے اشعار کا اثر بجلی کی طرح دل میں دَوڑ جاتا ہے، جو حالت وہ بیان کرتے ہیں اُس کی تصویر آنکھوں کے سامنے کھینچ دیتے ہیں۔ نسیمؔ کے اشعار زبان کی پاکیزگی اور ترکیب الفاظ کی چستی کے لحاظ سے تاثیر کا طلسم بنے ہوئے ہیں، ایک کی زینت حُسنِ صورت سے ہے دوسرے کی شانِ لطفِ معنی سے قائم ہے، میر حسنؔ سخن آفریں، نسیمؔ معنی آفریں ہیں۔ میر حسن محاورہ اور روز مرّہ کے بادشاہ ہیں۔ استعارہ، تشبیہہ نسیمؔ کا حصّہ ہے اور جو سوز و گداز میر حسنؔ کے کلام میں ہے وہ نسیمؔ کے کلام میں نہیں اور حقیقت یہ ہے کہ جو درد عموماً شعرائے دہلی کے کلام میں پایا جاتا ہے وہ اہل لکھنؤ کے کلام میں نہیں پایا جاتا۔ غرض کہ تناسبِ لفظی، اختصار، پختگی کلام، چستی، بندش، شوکتِ الفاظ، پاکیزگی زبان اس مثنوی (گلزارِ نسیم) کے خاص جوہر ہیں اور استعاروں اور تشبیہوں سے جو مینا کاری کی ہے اُس نے اور حُسن دوبالا کردیا ہے۔ نقادانِ سخن کا سرتاج اور اردو زبان کا مُستند مورّخ محمد حسین آزادؔ ''آبِ حیات'' میں لکھتا ہے۔ ''پنڈت دیا شنکر نسیمؔ نے ''گلزارِ نسیم'' لکھی اور خوب لکھی۔'' (دیباچہ گلزارِ نسیم از چکبستؔ)۔ اگر غالبؔ کے لطیف و پاکیزہ ظرافت کا رنگ دیکھنا ہے تو اُردو کے عاشق کو غالبؔ کے خطوں پر نظر ڈالنا چاہئے۔ اُردو نثر کے اِن جواہرات میں جہاں اور بہت سی لطافت و رنگینی کے جوہر موجود ہیں، وہاں ظرافت کی جھلک بھی کم دل کش نہیں ہے۔ نہ پھبتیاں ہیں نہ طعن و تشنیع کے جگر خراش فقرے ہیں۔ محض روز مرّہ کی باتیں ہیں مگر طبیعت کی شوخی، متین الفاظ کے پردے سے جھلکتی ہے اور پڑھنے والے کے چہرے پر مُسکراہٹ کا نُور پیدا کردیتی ہے۔ باریک اور لطیف مذاق کی رنگینی اور بے ساختہ پن پر جس قدر غور کرو اتنا ہی لطف آتا ہے۔ گویا زیرِ لب مُسکراہٹ ہے۔'' (مضامین چکبست ۱۹۲۸ء)



مُحی الدین قادری زور

(۱۹۰۴-۱۹۶۲ء)

زور ۱۹۰۴ء میں حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئے۔ جامعہ عثمانیہ سے ایم۔ اے اور لندن سے پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کر کے جامعہ عثمانیہ میں اُردو کے پروفیسر ہو گئے۔ اور عثمانیہ یونیورسٹی (حیدر آباد دکین) کے پی۔ ایچ ڈی کے طلبہ کی رہنمائی کی۔ ڈاکٹر زور نے اُردو ادب کی بہت خدمت کی ہے۔ یہ اِس عہد کے بے مثل ادیب اور انشا پرداز ہیں، جن کی معرکہ آرا کتاب ''روحِ تنقید'' ہے۔ جس میں قدیم زمانے سے لیکر اس دور تک کے تنقید کے ارتقائی مدارج کو سب سے پہلے اردو میں نہایت شرح وبسط کے ساتھ بیان کیا ہے۔ فن تنقید پر یہ ایک بیش بہا اور پُر از معلومات کتاب ہے، عرض مصنف میں لکھتے ہیں۔ ''فنِ تنقید پر اُردو میں یہ پہلی کتاب ہے، جو ۱۹۲۵ء میں قلمبند کی گئی تھی اور جس کے ذریعہ سے اہلِ اُردو کو یورپ کے طریقۂ تنقید سے واقف کرایا گیا تھا اور ترقی یافتہ زبانوں میں اس فن نے جس طرح ترقی کی ہے اور اس کے لئے رفتہ رفتہ جو اصول و آئین مدوّن ہوئے ہیں اُن کو روشناس کرنے کی کوشش کی گئی، تاکہ اہلِ اُردو فن تنقید کو ایک باضابطہ حیثیت سے سمجھیں اور اپنی زبان میں اسی معیار اور اسی پایہ کی تنقید نگاری کو ملحوظِ خاطر رکھیں۔'' تنقید ''جس طرح تنقیح ادیبوں کی تحریروں کے لئے معائب ومحاسن کا محاسبہ، ارتقائے ادب کا زبردست معاون ہے، تنقید نگاروں کے کام کی تنقیح بھی ادبی مذاق کی درستی کے لئے ضروری ہے۔ کیونکہ جس طرح ادیبوں کو آزاد چھوڑ دینا قوم کے لئے خطرناک ہے، تنقید نگاروں کو بے لگام کر دینا بھی ادب کے لئے مہلک ہے۔ مؤخرالذکر (تنقید نگار) کا کام سرانجام دینا پہلے سے بھی زیادہ دشوار ہے'' ''ایک بڑا انشا پرداز معاملاتِ خارجی اور امورِ قلبیہ دونوں کے اظہار میں، مہارتِ تامّہ رکھتا ہے اور نقاد کا کام یہ ہے کہ انشا پرداز کے اِن دونوں قسموں کے بیانات کو قدرت اور انسانی فطرت کے حقیقی واقعات کے ساتھ مقابلہ اور موازنہ کر کے اس کی ادبی خوبیوں کو جلوہ گر کر دے۔ تنقید نگاری کا اعلیٰ اصول یہ ہے کہ ادب کو صحیح اور تحقیقی طریقہ پر جانچا جائے اور خود ادیب ہی کے کارناموں سے اُس کے ذاتی معیّن کردہ اصول اخذ کئے جائیں۔'' نقاد کو ہمیشہ یہ ملحوظ رکھنا چاہئے کہ اُس کے تنقیدی فیصلے اس بات کے مظہر ہوں کہ اس کی علمیّت کتنی ہے اور اس کا ادبی ذوق کیسا ہے۔''

''میاتھیو آرنلڈ'' نے اس امر پر بجا طور پر زور دیا ہے کہ صرف ایک یا دو زبانوں کی ادبیات کا گہرا مطالعہ کامگار تنقید نگاری کے لئے ناکافی ہے۔ جب تک دُنیا کی ہر قوم وملک کے ادب کے شہ پاروں کی کم از کم نوعیت یا محاسن سے واقفیت نہ پیدا کر لی جائے تنقید نگاری ہرگز شروع نہیں کرنی چاہئے۔ صرف کسی ایک قوم یا زبان کے ادب پر حاوی ہو جانے سے کامیاب تنقید نگار ہرگز نہیں بن سکتا۔'' ''کسی تصنیف یا مُصنف کے ساتھ نقاد کا برتاؤ ایسے شفاف آئینہ کے مانند ہوتا ہے جو اس بات کو ظاہر کر دیتا ہے کہ اس کی شخصیّت کی کونسی خصوصیات اس کے تنقیدی کارناموں میں اپنی جھلکیاں دکھا رہی ہیں'' ''وہی اُسلوب بہترین خیال کیا جاتا ہے، جس میں گونا گوں اور رنگینیوں کی کثرت پڑھنے والے کو مسرت وحیرت میں ڈال دے۔ اگر کوئی جملہ طویل ہو تو کوئی بالکل چھوٹا کسی میں استعارہ ہو تو کسی میں تشبیہ، کبھی فصاحت جھلکیاں دکھا رہی ہو تو کہیں فطرت رُونما ہو۔ غرض تحریر ایک طوفان خیز سمندر ہو، جس کی مضطرب موجوں میں مدّ وجزر کی پوری کیفیت طاری ہو اور جس کی سطح کچھ ایسی عجیب وغریب، اشیا کا گہوارہ بنی ہوئی ہو کہ ان کی دلچسپیاں، پابستگانِ ساحل کو نہ صرف محوِ استغراق کر دیں بلکہ اس بات پر بھی مجبور کر دیں کہ وہ سمندر کی گہرائیوں میں گود پڑیں اور گراں بہا موتی حاصل کرنے کی کوشش کریں۔'' (رُوحِ تنقید ۱۹۲۵ء)



عظیم بیگ چغتائی

(۱۸۹۵۔۱۹۴۱ء)

چغتائی ۱۸۹۵ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے۔ درسی تعلیم کے بعد مُسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی کرکے ریاست جودھ پور میں ملازم ہوگئے۔ چیف جسٹس ہوگئے تھے کہ ۱۹۴۱ء میں انتقال کیا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اُردو میں مزاح نگار اپنے مکالمے اور طنز سے مزاح پیدا کرتے ہیں لیکن چغتائی کا پلاٹ ہی ہمیں ہنسنے پر مجبور کردیتا ہے۔ عظیم بیگ کا اسلوب، سادہ اور صاف ہونے کے باوجود بے کیف نہیں۔ اسی لئے پڑھنے والے کی دلچسپی کہیں بھی کم نہیں ہوتی۔ چغتائی نے خاصی کتابیں لکھیں، لیکن ان کی شہرت ''کولتار'' اور ''شریر بیوی'' کی منت کش ہے۔ ''کولتار ۱۹۳۶ء۔ اب پورا کا پورا چھتہ مع بھڑوں کے ڈبہ میں بند تھا۔ کان سے لگا کر میں نے بھڑوں کی بھنبھناہٹ سُنی اور میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ میں نے وہ ڈبہ چھجہ پر رکھ دیا۔ جب وہ حضرت میری شان میں قصیدہ چسپاں کرنے چھجہ پر آئے تو عقل اپنے کمرے میں چھوڑ آئے تھے۔ ایکدم سے میں نے ایک دبی ہوئی چیخ اور پیر ٹپکنے کی آواز سنی اور ساتھ ہی دبی اور گھٹی ہوئی آوازیں اور مُنہ پیٹنے کی تڑاتڑ، جیسے طمانچے پڑ رہے ہوں۔ پھر اُن حضرت کا پینترے بدلنا، اپنی آواز کو دبانا، گودنا اور بلبلانا۔ ادھر بھڑیں غصے میں بھری ہوئیں اور اُدھر چھتیں پڑی ہوئیں۔ گویا یہ بھڑوں کے ساتھ بند ہوگئے۔ یہ دیکھ کر میری طبیعت خوش ہوگئی کہ میں نے خوب سبق پڑھایا'' ''میں دُلہن بنی ہوئی تھی۔ میں نے کسی کے اپنے قریب آنے کی آہٹ سُنی۔ میرا دل بانسوں اچھل رہا تھا کہ اتنے میں آنے والے نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ کان کے پاس مُنہ کرکے کہا۔ ''کولتار صاحب: السّلام علیکم۔'' میرے اُوپر گویا بجلی گر پڑی اور تمام جسم میں ایک سن سنی دوڑ گئی۔ یہ شرارت آمیز لہجہ میرے لئے نیا نہ تھا۔ میں خوب جانتی تھی کہ پھر اسی عزیز ترین شخص نے کہا۔ اجی کولتار صاحب! وہ بھڑوں کا چھتہ' میرے تمام مُنہ پر لپٹ گئی تھیں' شریر بیوی ۱۹۳۴ء ''جب گھی میں بھُنی ہوئی سوجی میں سے خوشبو نکلنے لگی تو بجائے شکر کے جو پسی ہوئی تھی خوب اچھی طرح سے نمک ڈالا۔ جلدی سے تیار کرکے حلوہ اُتارا گیا اور نہایت تکلف سے اِس کو زعفران اور کیوڑہ کی خوش بُو دے کر پلیٹوں میں رکھ کر سُنہری ورق لگائے گئے اور میوہ کی افشاں چھڑکی گئی۔ اب مُرغ کے قورمہ کا حال سنیے، اُس میں بجائے نمک کے نہایت اطمینان سے شکر ڈالی گئی اور سب چیزوں میں سے تھوڑا تھوڑا ہماری شریر بیوی نے بیرسٹر صاحب کے ہاں بھیج دیا، تاکہ کھانے کے وقت پہنچ جائے۔ شام کو بیرسٹر صاحب ملنے آئے اور حلوہ کا شکریہ ادا کیا۔ اب بیگم نے ہم پر بھی ہاتھ صاف کرنا چاہا۔ ہم نے جو چائے کی پیالی کی طرف دیکھا تو وہ ہنسنے لگی۔ ہم نے کہا کہ کیا دیوانی ہوئی ہو۔ کیوں ہنستی ہو؟ اِس پر وہ اور ہنسی اور پان والے کا قصہ کہنے لگی۔ ہم اس طرح چائے چلا رہے تھے کہ ہمارا شبہ کچھ مٹ گیا تھا اور ہم نے چائے کی پیالی پینے کے واسطے اٹھائی کہ اُس کو پھر ہنسی آئی جس کو اُس نے تھوکنے کے بہانے سے ٹالنا چاہا۔ وہ آتش دان میں تھوکنے اٹھی اور اِدھر ہم نے موقع پا کر احتیاطاً اس صفائی سے چائے کی پیالی بدلی کہ اُس کو شبہ تک نہ ہوا۔ ہم اِس چائے سے کھیل رہے تھے کہ جیسے اُس کے ٹھنڈا ہونے کا انتظار کر رہے ہیں کہ اُس نے اپنے آگے کی چائے کی پیالی اٹھائی جو ہمارے لئے کونین سے زہر ہلال کرکے رکھی تھی، پہلے ہی گھونٹ میں بس اُس کو مزہ آگیا اور ہم نے جھک جھک کر سلام کیے۔ اُس کا بھی ہنسی کے مارے بُرا حال تھا کہ تھوکنا مصیبت ہوگیا۔'' **چغتائی آرٹ** ''سامنے دربار کا عالیشان ہال تھا جس کے دروازوں اور کھڑکیوں سے راگ اور نغموں کی لپٹیں نکل رہی تھیں۔''



آلِ احمد سُرور
(۱۹۱۲-۲۰۰۲ء)

سرور کی پیدائش ۱۹۱۲ء میں بدایوں (یو۔پی) میں ہوئی اور آپ نے سینٹ جانس کالج آگرہ اور مُسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں تعلیم پائی۔ ڈاکٹر بننے کا ارادہ تھا۔ لیکن اُردو ادب نے اپنی طرف کھینچ لیا۔ انگریزی اور اُردو میں ایم۔اے۔ کر کے علی گڑھ میں صدر شعبۂ اُردو ہو گئے۔

سرور اُردو کے مشہور نقاد ہیں۔ اِن کی تنقیدی تحریریں بہت سلجھی ہوئی ہیں انہوں نے نئی اور پُرانی شاعری پر جو تنقید کی ہے وہ اُردو کی فنِ تنقید نگاری میں ایک اضافہ ہے۔ اِن کی تحریر میں شگفتگی نُدرت و لطافت ہے۔ اُن کے شعور میں پختگی اور جذبات میں پاکیزگی ہے۔ **نئی اور پُرانی شاعری کا تجزیہ** "اُردو شاعری نے سینکڑوں رُوپ بدلے۔ کبھی مشاہدۂ حق ادا کرتی رہی، کبھی بادۂ وساغر میں ڈوبی رہی۔ کبھی تلوار سے کھیلی، کبھی دِلوں کے اندر ڈوب گئی۔ مگر اس کی بدمستی میں کوئی نہ کوئی ہشیاری، ہر خواب میں کوئی بیداری، ہر جلوۂ بے رنگ میں کوئی نہ کوئی رنگینی ضرور رہی اور اس ہشیاری، بیداری اور رنگینی میں زندگی کا کوئی خاص تصوّر اور سانچہ بھی ملتا رہا" "اُردو شاعری کا شاہکار "غزل" ہے غزل حُسن وعشق کی ترجمان اور محبت کی داستان ہے۔ جب تک دنیا میں چاندنی، بہار، جوانی، نغمہ، سبزہ، موجود ہے اور اُس کی دلکشی باقی ہے غزل بھی زندہ ہے اور اس کا حُسن بھی تابندہ" "ہمارے ادب کو ایک کٹھن منزل درپیش ہے۔ ایک طرف ہمارا وہ سادہ سرمایہ ہے جو ولی اور میر سے لیکر حسرت تک پہنچا ہے۔ اس سرمائے میں ایک خاص نقطۂ نظر، ایک کار آزمودہ اسلوب، ایک جانی پہچانی رمزیت، اشاریت، زندگی کا ایک خاص فلسفہ اور ادب کا ایک خاص شعور ملتا ہے۔ دُوسری طرف بیسویں صدی کے نت نئے شگوفے ہیں، نئے نئے خیالات، اسالیب، نئے علاماتِ زندگی، اور ادب کا نیا تصوّر، لب ولہجہ میں ایک نئی کیفیت، ایک نیا مزاج۔ ان دونوں میں کسے ترجیح دی جائے۔ کسے ترک کیا جائے، کسے اختیار۔ یہ فیصلہ آسان نہیں۔ اس میں مدد دینے کے لئے چند اُصولی باتیں، کچھ تاریخی حقائق اور کچھ اس دَور کی خصوصیات ذہن میں رکھنا ضروری ہیں۔ تا کہ ہمارا فیصلہ ضد یا ہٹ دھرمی یا تنگ نظری یا سطحیت سے بلند کہا جا سکے" "جنگِ عظیم نے آکر دنیا ہی بدل دی۔ شاعری میں قومی رنگ، اِس کی علامات میں قومی جذبات کی جھلک، دَار ورسن میں ایک نئی کشش اور زنجیر میں ایک نئی جھنکار، اس کے اثر سے آئی۔ چکبست کی شاعری کا آخری دَور اور پریم چند کے افسانے اِس خاموش تبدیلی کی ایک اچھی مثال ہے" "نئی شاعری کے پیش رو حالی ہیں۔ مگر اس کے فلسفی اقبال ہیں۔ اقبال نے پُرانی زبان میں نئے خیالات ادا کئے۔ حالی، اکبر، چکبست اور اقبال کے ہاتھوں غزل میں حکیمانہ، اصلاحی اور عصری رجحانات پیدا ہو جاتے ہیں" "پہلے ادب زیادہ تر سُلاتا اور رلاتا تھا۔ اب بھی سُلاتا اور رُلاتا ہے۔ مگر نیا ادب بیدار بھی کرتا ہے۔ بیداری سے خواب زیادہ حُسین اور خوش آیند معلوم ہوتا ہے۔ مگر بیداری میں بھی حُسن اور آہنگ ہے۔ نئی شاعری میں لذئیت بھی ہے، فرار بھی، اور جذبات پرستی بھی۔ مگر اس کے دوش بدوش بغاوت اور تخریب، تعمیرِ عمل، عمومیت، خارجیت، ذہنی فلسفہ، نفسیاتی شعور بھی، نئی شاعری محض تفریحی یا رومانی ہونے پر قانع نہیں۔ اس میں سنجیدگی ہے۔ اگرچہ ابھی گہری سنجیدگی نہیں آئی جس کی ضرورت ہے۔" (نئے پُرانے چراغ ۱۹۴۶ء) ادب کا اچھا نقاد زبان کا بھی اچھا نباض ہوتا ہے" "نقاد محض فلسفی یا مُبلغ یا ماہر نفسیات نہیں ہوتا۔ وہ صاحب نظر ہوتا ہے" "اچھی تنقید ذہن میں روشنی کرتی ہے اور یہ روشنی اتنی ضروری ہے کہ بعض اوقات اس کی عدم موجودگی میں تخلیقی جوہر کسی شے کی کمی محسوس کرتا ہے۔ گویا تنقید ادیبوں، ادب سے مُسرت اور خیر وبرکت کرنے والوں اور خود ادب کے لئے ایک مشعلِ ہدایت ہے۔ تنقید ادب میں ایجاد کرنے، اور محفوظ رکھنے، دونوں کا کام انجام دیتی ہے" "اچھی تنقید میں جذبے کو ایک نازک، پختہ اور مُہذب احساس کا نکھار مل جاتا ہے۔ اسی لئے اچھی تنقید محض تخریبی نہیں ہوتی۔ محض خامیوں یا کوتاہیوں کو نہیں دیکھتی، وہ بلندیوں کو دیکھتی ہے اور یہ اندازہ لگاتی ہے کہ یہ بلندی کیسی ہے۔ حالی کے الفاظ میں وہ حیرت انگیز جلووں کا پتہ لگاتی ہے، وہ پستی کا احساس رکھتی ہے مگر پست نہیں ہوتی۔" (تنقید کیا ہے۔ ۱۹۴۷ء) سرور نے ۲۰۰۲ء میں قضا کیا اور مسلم یونیورسٹی کے قبرستان میں دائمی جگہ پائی۔



ڈاکٹر سیّد عبداللہ

(۱۹۰۶-۱۹۸۶ء)

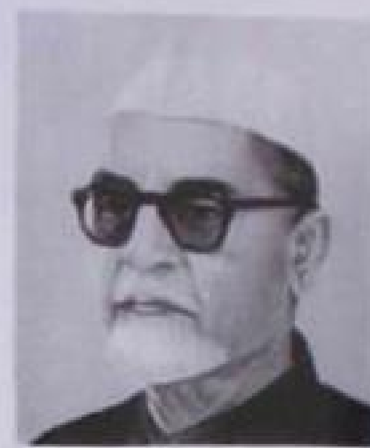
سید صاحب کی پیدائش ۱۹۰۶ء میں ہوئی تھی۔ والد کا نام سیّد نور احمد شاہ۔ وطن ضلع ایبٹ آباد (صوبہ سرحد) جامعہ ملیہ علی گڑھ اور لاہور میں تعلیم حاصل کی۔ مشہور محقق پروفیسر محمود شیرانی کے شاگرد ہیں۔ ۱۹۲۵ء میں ''فارسی'' اور ۱۹۳۲ء میں ''عربی'' میں ''ایم اے'' کیا اور ۱۹۳۵ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ''ڈاکٹر آف لٹریچر'' کی ڈگری حاصل کی اس کے بعد اورینٹل کالج لاہور کے پرنسپل ہوگئے۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ اپنے دَور کے مشہور نقاد ہیں۔ ذوقِ جستجو، جذبۂ تحقیق، ژرف نگاہی، مُطالعہ کی وسعت اور شگفتہ اسلوبِ نگارش ان کی منفرد خصوصیات ہیں اور وہ ایک ماہر کی طرح نقد و جرح کا کام نہایت چابک دستی اور احتیاط کے ساتھ کرتے تھے۔ اہلِ نظر جانتے ہیں کہ تنقید کا کام کتنا نازک اور سخت ہے۔ پھر بھی ڈاکٹر عبداللہ کامیاب ناقد ہیں۔ میر کا انداز۔ ''یوں تو ہر بڑا شاعر ایک خاص طرز کا مالک ہوتا ہے۔ مگر بعض صاحبِ کمال ایسے ہوتے ہیں جن کے ہُنر اور فن کی نمایاں خصوصیات نہ صرف اپنے دَور کو متاثر کرتی ہیں بلکہ مستقبل میں بھی لوگ اُن کی طرزِ خاص کو مانتے اور اُس کا تتبع کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ میر تقی میر بھی ایسے ہی صاحبِ کمالوں میں سے ایک تھے۔ اُن کی شاعری کا اعتراف نہ صرف اُن کے معاصرین نے کیا بلکہ اُن کے بعد بھی تقریباً ہر دَور میں بڑے بڑے شاعروں نے اُن کے فن کو سراہا اور مختلف پیرائیوں میں اُن کو خراج تحسین ادا کیا۔ مثلاً سودا، مصحفی، ناسخ، غالب، ذوق، اکبر الہ آبادی، حسرت موہانی۔ میر کے معتقدوں میں ہر دَور کے بڑے بڑے شاعر اور باکمال شامل ہیں، جو خود بھی اپنے زمانے کے مسلم استاد ہیں اور اُن میں سے بعض تو عظمت کی صف میں بہت بڑے درجے اور رُتبے کے مالک ہیں'' ''میر نے جو شاعری دنیا کے سامنے پیش کی ہے اُس میں عظمت بھی ہے۔ اور حُسن بھی۔ اُن کی شاعری میں اُن کی انفرادیت کے گہرے نقوش موجود ہیں۔ یہ انفرادیت اُن کے موضوعوں میں بھی ہے اور اُن کے اسلوب میں بھی۔ اسی انفرادیت کو دنیا میر کے مخصوص رنگ کے نام سے یاد کرتی ہے۔ یہ کمال اُن کے مضمون میں بھی ہے اور اُن کی زبان و بیان میں بھی'' ''میر کے پاس درد و غم کے مضامین کے حقیقی سرچشمے اُبل رہے ہیں۔ اس لئے اُن کے کلام میں بے انتہا اثر اور سوز ہے۔'' ''وہ تمام خصوصیات جو میر کے انداز کی مجموعی طور پر نمائندگی کرتی ہیں۔ پانچ ہیں۔ اوّل خلوص اور صداقت (جس کی وجہ سے اظہار میں قطعیت پیدا ہوئی ہے) دوم معمولیات کی کامیاب مُصوّری۔ سوم۔ لہجہ عام اور بول چال کا انداز۔ چہارم۔ پیرایہ ہائے ادا کی مانوسیّت۔ پنجم صوتی محاسن'' (نقد میر ۱۹۵۸ء) درد۔ ''میر درد اُردو کے بڑے غزل گو صوفی شاعر ہیں، اُن کی غزل کی عظمت اُن کے زمانے میں بھی تسلیم ہوئی اور آج بھی تسلیم کی جاتی ہے۔ اُن کی غزل میں وہ سوز و گداز اور لطف موجود ہے، جو عام صوفی شاعروں کی غزل میں نہیں ہوتا'' ''میر اور درد کا زمانہ بڑے حوادث کا زمانہ تھا۔ میر تقی میر کے برعکس درد کے کلام سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہیں مشاہدہ، الم سے لطف حاصل ہوتا ہے۔ ایک عارف اور صوفی حقیقت۔ گہرائیوں تک پہنچنا چاہتا ہے۔ یہ مقصد درد کا بھی ہے۔ مگر یہ محسوس ہوتا ہے کہ درد زندگی کے خارجی مظاہر کی ''دید'' سے بھی لطف اندوز ہوتے ہیں۔ وہ میر کی طرح مئے ہنگامہ ہائے محفل سے بیزار نہیں۔ بلکہ انہیں اِنھی ہنگاموں میں شریک ہوکر مسرت حاصل ہوتی ہے۔ اِن کا لب و لہجہ، اِن کا اندازِ بیان، اِن کی آواز دوسرے شعراء سے مختلف ہے۔ اور مضامین سے قطع نظر شاعری کے خارجی عناصر سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ درد کا کلام ایک صُوفی شاعر کا کلام ہے'' (بحث و نظر ۱۹۵۲ء) حالی کا تنقیدی شاہکار مقدمۂ شعر و شاعری ہے جس میں سلاست روی اور اعتدالِ طبیعت کا احساس ہوتا ہے اور شبلی کی شعر العجم میں اِس کے مصنف کے جمالیاتی ذوق اور رنگینیٔ مزاج کا اثر پڑتا ہے۔ شبلی کے نظامِ تنقید میں نیچر کو وہ بنیادی حیثیت حاصل نہیں جو حالی کے یہاں اُس کو حاصل ہے۔ شبلی کے نزدیک اعلیٰ ادب اور آرٹ کا نصب العین یہ ہے کہ وہ فطرت کی تکمیل کرے اور حُسن کے اعلیٰ اور مثالی پیکروں کی مُصوّری بھی کرے۔ شبلی حالی کے مقابلہ میں زیادہ جمالیت کے دلدادہ ہیں'' ''حالی نے پُرانی تنقید کو ایک نظریہ بخشا انہوں نے مغربی تنقید اور مشرقی نقد و نظر میں ایک پیوند قائم کرنے کی کوشش کی'' (سر سیّد اور اُن کے رفقاء ۱۹۶۱ء)



شوکت تھانوی

(۱۹۰۹ء-۱۹۶۳ء)

شوکت تھانوی ۱۹۰۹ء میں پیدا ہوئے۔ ریڈیو پاکستان کے ''قاضی جی'' اور مشہور مزاح نگار ہیں۔ ان کی عبارت کی روانی، طرزِ بیان کی دلآویزی، بے تکلفی اور شوخی سے کوئی مضمون خالی نہیں ہوتا۔ ''سودیشی ریل'' ان کی شہرت کا سنگِ بنیاد ہے اور ''شیش محل'' سیرت نگاری کا مرقع۔ سودیشی ریل: بابوجی! کانپور کا سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ دے دیجئے''۔ بابوجی! ایک بات کہہ دیں یا مول تول؟'' میں سمجھا بابوجی مذاق کر رہے ہیں اور میں ہنس دیا۔ میرے ہنسنے پر بابوجی نے کہا ''جناب سُنیئے تین روپے ہوئے۔ لایئے روپے اور ٹکٹ لیجئے''۔ اب تو مجھے اور زیادہ تعجب ہوا اور میں نے کہا ''جناب! تین روپے کیسے ہوئے؟ ایک روپیہ تیرہ آنے تو کرایہ ہے، آپ کہتے ہیں تین روپے''۔ بابوجی نے ذرا ترش رو ہوکر جواب دیا۔ ''جی چاہے لیجئے ورنہ جانے دیجیے''۔ میں نے کہا۔ آج کیا ہوگیا کہ ایک دم کرایہ بڑھ گیا۔ بابوجی ''کل کی بات کل کے ساتھ''۔ آج دیش ہمارا ہے۔ ہم کو سُوراج مل گیا ہے۔ اچھا نہ آپ کی بات نہ ہماری بات، ڈھائی روپے دے دیجئے اور ٹکٹ لے لیجئے''۔ مجھ کو جاتا ہوا دیکھ کر بابو صاحب نے پھر آواز دی''۔ سنئے تو جناب! اچھا دو روپے دیجئے۔ آیئے وہی ایک روپیہ تیرہ آنے دیجئے۔ اچھا آپ بھی کیا کہیں گے، لایئے ڈیڑھ روپیہ۔ اب اس سے زیادہ کم نہیں کریں گے ہمارا نقصان ہو رہا ہے''۔ جب ہم نے ٹکٹ کے بازار کا بھاؤ اس طرح گرتے ہوئے دیکھا تو اور اکڑ گئے۔ ایک روپیہ دیں گے۔ ''لایئے صاحب لایئے، بوہنی کا وقت ہے۔ آپ ہی کے ہاتھوں بوہنی کرنا ہے''۔ ٹکٹ تو ہم نے لے لیا لیکن نہ اُس پر تاریخ تھی اور نہ کچھ چھپا تھا۔ بابو نے ایک کاغذ کے ٹکڑے پر درجہ دوم کانپور لکھ کر ٹیڑھی سے لکیر کھینچ دی تھی جو غالباً اُن کے دستخط تھے۔ ہم نے جو ٹکٹ کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا تو وہ ہمارا مطلب سمجھ گئے اور متبسم ہوکر کہنے لگے۔ ''جناب والا! رات کو سُوراجیہ ملی ہے ابھی ٹکٹ چھپے نہیں، آپ اطمینان سے سفر کیجئے، کوئی نہ پوچھے گا۔'' گاڑی میں بیٹھے بہت دیر ہوگئی تھی تو ہم نے پوچھا۔ گاڑی کا وقت تو ہو چکا۔ جواب ملا ہو جایا کرے۔ جب تک ریل نہ بھر جائے کیسے چھوڑی جا سکتی ہے، کیا خالی گاڑی چھوڑ دی جائے؟ ہم کو بیٹھے ایک گھنٹہ ہوگیا۔ اب گارڈ نے سیٹی بجائی۔ دو تین مرتبہ سیٹی بجا کر اور جھنڈی ہلا کر آخر غصہ میں انجن کی طرف جھپٹے اور ڈرائیور کو ڈانٹنا شروع کردیا۔ ڈرائیور نے کہا۔ میرا کیا قصور ہے دو گھنٹے سے للو فائرمین کوئلہ لینے گیا ہوا ہے۔ کہہ دیا تھا کہ لپک کر جلدی آنا۔ ابھی تک غائب ہے۔ پتہ بھی بتا دیا تھا کہ رکاب گنج کے چوراہے سے یا عیش باغ کے پھاٹک سے لے آنا، دو چار پیسے کم زیادہ کا خیال نہ کرنا، مگر وہ جاکر مر رہا۔ اب بتایئے میرا کیا قصور ہے۔ گارڈ بھی ڈرائیور کو بے قصور سمجھ کر چپ ہو گئے۔ حسرت موہانی۔ ''اُجاڑ سی صورت، عینک میں ایک طرف دھجی بندھی ہوئی، نیلی سی ترکی ٹوپی، اٹنگا۔ چارخانے کا پاجامہ، ڈھیلی ڈھالی اچکن، پیروں میں میلا سا کرمچ کا جوتا، چیں چیں کرتی ہوئی آواز اور عجب بھدّا سا نقشہ۔ ثاقب کانپوری نے تعارف کرایا کہ ''آپ مولانا حسرت موہانی ہیں''۔ میں تو سکتے کے عالم میں رہ گیا۔ یا اللہ! ایسے ہوتے ہیں حسرت موہانی۔ لیکن وہ اپنی اسی کج دھج میں وقیع نظر آنے لگے''۔ اختر شیرانی۔ ''رسائل میں کافی پڑھا ہے۔ یوں بہت کم دیکھا ہے اور جس قدر دیکھا ہے اُس سے بھی بہت کم سمجھا ہے۔ البتہ اس بات کی قسم کھائی جاسکتی ہے کہ عالم ہوش میں کبھی نہیں دیکھا۔ میں اپنی حیرت کے نشے میں تھا اور وہ اپنے ذاتی نشہ میں۔ سیراب تشنہ کام۔ میں نے اس بلا کی پیاس کبھی نہیں دیکھی۔ صحرا میں پیاس تو دیکھی ہے مگر دریا کے اندر بھی پیاس! (شیش محل، ۱۹۴۳ء)



ذکر-ذاکر حسین خان

(۱۸۹۷-۱۹۶۹ء)

خاندان، وراثت اور خون کا اشتراک نیز اس کی اہمیت کا علم بلکہ احساس اگر نہ ہو تو قوم اور نسل کی آگہی ممکن نہیں۔ تفصیل میں جائے بغیر نفس مضمون کے تحت خاندان کا نسب نامہ ہماری رہبری کے لئے کامل سہارا ہوتا ہے، لہٰذا ذاکر حسین خان کا مختصر نسب نامہ ملاحظہ ہو۔

غلام حسین بن محمد حسین خان کے یہاں عطا حسین اور فدا حسین خان دو بیٹے پیدا ہوئے۔ عطا حسین تو لاولد گذر گئے مگر فدا حسین خان کے یہاں سات بیٹے ہوئے۔ جن میں سے تین بیٹوں کے یہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ مگر مظفر حسین، ذاکر حسین، یوسف حسین اور محمود حسین کے یہاں اولادیں ہوئیں۔ ذاکر حسین خان کو اللہ نے دو بیٹیاں صفیہ اور سعیدہ عطا کی۔ ذاکر صاحب کی پیدائش ۸/فروری ۱۸۹۷ء کو حیدر آباد (دکن) میں ہوئی تھی۔ ذاکر صاحب کا بیان تھا کہ ان کی عمر ابھی ۱۵ سال کی ہوئی تھی اور وہ زیر تعلیم ہی تھے کہ ان کی شادی شاہ جہاں بیگم سے کرادی گئی۔ لیکن ذاکر صاحب نے تعلیم کا سلسلہ برقرار رکھا۔ یہاں تک کہ ایم او کالج علی گڑھ سے ایم۔ اے اور پھر جرمنی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ مسئلہ خلافت اور ملکی حالات کے تحت دورانِ تعلیم ہی میں سیاست سے وابستگی اختیار کرنی پڑی۔ اور پھر ایم اے او کالج علی گڑھ کے تدریسی عمل کے خلاف جو تحریک شروع کی گئی تھی۔ اس کے روح رواں بن گئے اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کی سربراہی بھی ان کو اختیار کرنی پڑی۔ ان حالات کو نظر انداز کرتے ہوئے، ذکر کروں گا کہ ذاکر صاحب نے جامعہ ملیہ اسلامیہ اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری کے سوا بہار کی گورنری پھر نائب صدر ہندوستان کی زمام کے بعد صدر مملکت ہند کے درجہ پر بھی فائز ہوئے۔ تعلیمی میدان اور قلمی میدان میں ذاکر صاحب کی تصنیفات موجود ہیں لیکن میری دانست میں ان تصنیفات سے اہم کام۔ ''دیوانِ غالب'' کی اشاعت جرمن کی اہمیت زیادہ ہے۔ خصوصی طور پر اس کا دیباچہ، مصنف لائق ذکر و فکر ہے۔ یہ تحریر دیباچہ کی عام طور پر دستیاب نہیں، مگر غیر ممالک جرمنی میں ذاکر صاحب نے اپنی بصیرت اور ادراک فہم سے اسے قابل اعتنا خیال کر کے شریک نسخہ کیا۔ لہٰذا اسے شریک و تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس نسخہ جرمن کی ایک اہم حیثیت میری دانست میں اور بھی ہے کہ اس کے ٹائٹل کور پر یہ عبارت درج ہے:

''مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ کے لئے مطبع شرکت کاویانی برلن نے طبع کیا۔ ۱۳۴۱ھ ۱۹۲۲ء: میں گویا اس نسخہ کی طباعت کو اب ۹۱ سال کی مدت گزر چکی ہے۔

ذاکر صاحب اردو اور فارسی زبان کے شناور، فاضل اور معاشیات کے ماہرین میں سے تھے۔ وہ انگریزی زبان سے بھی کما حقہ واقف تھے۔ ان کی زبان صاف اور لہجہ پاک تھا۔ رشید احمد صدیقی صاحب کا بیان تھا کہ ذاکر صاحب مضمون سیاق و سباق کو آئینہ دری سے استعمال کرنے کے گر سے واقف تھے، ان کے مضامین اور خطبے اس کے شاہد ہے۔ تحریر شگفتہ اور دلفریب ہے۔ جس کے مطالعے سے آپ خود فیصلہ کر سکتے ہیں۔ ذاکر صاحب نے ۱۹۶۹ء میں دلی میں قضا کیا، جامعہ ملیہ مدفن ہے۔

سب سے اخیر میں ذاکر صاحب کی وہ نادر تحریر جو راقم کو ۱۹۶۸ء میں گورنر بہار کی حیثیت سے پٹنہ سے ارسال کی تھی، وہ پیش کی جارہی ہے۔ یہ تحریر مصدقہ اور لائق افتخار ہے کہ لفافہ پر پتہ تک ذاکر صاحب نے اپنے دستِ قلم سے تحریر کیا ہے۔ اس سے جو خصوصیت ہویدا ہے اسے مدنظر رکھنا لازمی ہے۔

راج بھون پٹنہ ۳۱ / مارچ ۵۹ء

مکرم بندہ، تسلیم تعمیل ارشاد کرتا ہوں۔ سچ یہ ہے کہ مجھے اپنے متعلق بہت کم علم ہے۔ تاریخیں یاد نہیں رہتیں، چنانچہ نہ پیدائش کی صحیح تاریخ معلوم ہے، نہ وفات کی۔ میٹرک اور بی۔ اے دو سال جو لکھے ہیں وہ ضرور صحیح ہیں۔ ایم۔ اے، پی ایچ ڈی کے سال میں ممکن ہو غلطی ہو سکتی ہے کہ ۲۶ ہو، ۲۰ نہ ہو۔ میں نے تعمیل کر دی۔ اب آپ اس پرزہ کو پھاڑ کر پھینک دیں۔ والسلام

مخلص ذاکر حسین

Syed Murtaza Husain Bilgrami sb.

Press Information Bureau

(Urdu Section) Parliament Street, New Delhi

نام ذاکر حسین

ولدیت فدا حسین خاں

ساکن قائم گنج ضلع فرخ آباد (اتر پردیش) [illegible] حیدرآباد دکن

تاریخ پیدائش فروری ۱۸۹۷ء

تعلیم - میٹرک ۱۹۱۳ء اسلامیہ اسکول۔ ~~پنجاب یونیورسٹی~~ گورنمنٹ بورڈ یوپی سال ۱۹۱۳ء

بی اے ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ الہ آباد یونیورسٹی سال ۱۹۱۸ء

ایم اے۔ پی ایچ ڈی برلن یونیورسٹی سال ۱۹۲۰ء

پی ایچ ڈی کا عنوان ہندوستان کی معیشت [illegible]

برلن یونیورسٹی سال ۱۹۲۶ء

دیگر معلومات و تصانیف۔

Capitalism: An Essay in Understanding

معاشیات: مقصد و منہاج

خطبات تعلیمی (اردو)۔ [illegible]

Patel Memorial Lectures on the Principles of Educational Reconstruction

تراجم: افلاطون کی کتاب ریاست (اردو)؛ معاشیات قومی، فریڈرک لسٹ کی جرمن Das nationale System der politischen Oekonomie کا اردو ترجمہ

[illegible] معاشیات، ایڈون کینن کی کتاب Elements of Economics کا اردو ترجمہ

[illegible]

دستخط ذاکر حسین

مورخہ ۳۱ مارچ ۱۹۵۹ء

شہر

(۶۷)



ڈاکٹر معین احسن جذبی

(۱۹۱۲ـ۲۰۰۵ء)

انقلاب ۱۸۵۷ء میں ہندوستانیوں سے تاج وتخت چھین کر طوق وسلاسل بخشا گیا۔ مگر تصور آزادیٔ ملک کا جذبہ مسلمانوں میں ہردم تازہ رہا۔ علماء کی جماعت اور سلاطین دہلی ولکھنؤ پر بھی، آفات عرضی وسماوی آتے رہے۔ مگر زندہ قومیں خوف وہراس سے متاثر نہیں ہوتیں۔ انہوں نے اس تاراجی کا مداوا ''تعلیم'' کے تکملے میں تلاش کیا۔ سرسید کی ''تحریک علمی'' نے قوم میں بیداری کی لہر پیدا کرنے کا شعور پیدا کیا اور ہندوسندھ کے مسلمانوں کو علم سے روشناسی کو لازمی قرار دیا۔ شکر ہے کہ آج ہر مقام پر علی گڑھ کا سند یافتہ شخص بھی ملے گا ،اور عام مسلمان بھی، مسلمان اب تعلیم کی سمت رَواں دَواں نظر آرہا ہے کہ تحریک علمی علی گڑھ کا مقصد اصلی بھی یہی تھا۔

آج ہم آپ اسی علی گڑھ کے ایک ہونہار طالب علم کے ''یادگاری جلسے'' میں شرکت کے لیے یکجا ہیں۔ تمہید سے قطع نظر اس فرد کا نام ڈاکٹر معین احسن جذبی ہے۔ مختصر ترین سوانح حیات اُن کے دست وقلم کی راقم کی تحویل میں ہے۔ جذبی صاحب نے ابتدائی تخلص ملالؔ رکھا تھا۔ اس تخلص سے بہت کم لوگ آشنا ہونگے، مگر خود موصوف نے اپنی ایک گفتگو میں جو مقطع سنایا تھا، وہ آپ بھی سن لیں:

تھی حقیقت میں وہی منزلِ مقصود ملالؔ	جس جگہ تجھ سے قدم آگے بڑھایا نہ گیا

جذبی صاحب کی پیدائش ۱۹۱۲ء کی ہے۔ آپ نے میٹرک تو جھانسی سے ۱۹۲۹ء میں اور انٹر آگرہ سے مگر بی اے دہلی کالج سے کرنے کے بعد ۱۹۴۲ء میں مسلم یونیورسٹی سے ایم اے اُردو میں کیا، ۱۹۴۵ء میں لکچرر شپ قبول کرلی۔ بعدہٗ حالی کی سیاسی شعور کے عنوان سے ۱۹۶۵ء میں پی ایچ ڈی کیا اور علی گڑھ کو ہی اپنا مامن ومسکن قرار دے دیا۔

شاعری میں جذبی صاحب نے اپنا استاد حامد شاہجہاں پوری اور صادق دہلوی کو لکھا ہے۔ مگر تخلص اپنا پہلے ملالؔ پھر جذبیؔ رکھا۔ بہر کیف! جذبی صاحب نے جوش ملیح آبادی، جگر مرادآبادی، فانی بدایونی، رشید احمد صدیقی وغیرہ سے فیض حاصل کیا یا نہیں مگر تعلق خاطر ضرور رکھا، اور اپنی بساط علمی وشعری کو علم وادب کے سائے میں پروان چڑھایا۔

جذبی کی شاعری اور ملازمت کی عمر ساتھ ساتھ پلی اور بڑھی، اس کے شواہد موجود ہیں اور نمونہ کلام بھی۔ مگر اس وقت میں ایک طویل نظم کا ذکر کروں گا، جو کلیاتِ جذبی میں اب بھی شریک نہیں ہے۔ مثلاً ساہتیہ اکیڈمی نئی دہلی نے جو کلیاتِ جذبی شائع کی ہے، اس میں اس نظم کا ذکر نہیں ہے۔ راقم نے ۱۹۹۵ء میں رسالہ 'آج کل' دہلی کو یہ غیر مطبوعہ نظم ارسال کی تو مدیر نے مجھے واپس ارسال کردی۔ چونکہ یہ نظم کلیاتِ جذبی میں نہیں ہے، اس لیے شائع نہیں کی جاسکتی۔ اس کی خبر کسی طرح شاہد علی خاں مدیر 'کتاب نما' دہلی کو مل گئی۔ موصوف نے اصرار کرکے وہ نظم مجھ سے حاصل کی اور 'کتاب نما' میں شائع کرادی۔ جذبی صاحب کی نظر سے جب یہ ''شہر آشوب'' گزری تو موصوف نے مجھ سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ ملنے پر کہا، ''بلگرامی صاحب! میرے ذہن میں اب اس طویل نظم کے ایک دوشعر ہی حافظے میں رہ گئے ہیں، اچھا کیا آپ نے تجدید فرمادی۔''

آج ۳۰؍مارچ ۲۰۱۳ء کو شعبۂ اُردو مسلم یونیورسٹی کے اس علمی مذاکرے میں اس ''شہر آشوب'' کے ذریعے جذبی صاحب کو خراج عقیدت پیش کررہا ہوں۔ یہ نظم ایک سو گیارہ اشعار پر محیط ہے۔ جسے اپنے عہد کے وائس چانسلر ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کو بطور شکایت ارسال کی تھی۔ واقعہ یہ تھا کہ اُن کو یونیورسٹی سے مکان الاٹ نہیں ہورہا تھا۔ طلب، تقاضہ کے باوجود اُن کو ناکامی ہی مل رہی تھی۔ اس خاکہ کو اسی نظریے سے دیکھا جائے، مگر جو کیف اس میں شریک ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اس سے قبل جذبی صاحب کے یہ اشعار بھی ملاحظہ کریں۔

جب کبھی کسی گل پر اک ذرا نکھار آیا	کم نگاہ یہ سمجھے موسم بہار آیا
یوں تو سیکڑوں غم تھے پر جہاں میں جذبیؔ	بات ایک مدت کے دل کو ساز گار آیا

نظم جذبی

اے مری جامعہ کے سر کے تاج — تجھ سے کیا کہیے، کیا نہ کہیے مگر
یہ نہیں دور مدح خوانی کا — ورنہ پڑھتا میں ایک قصیدہ، تر
جس میں اوصاف تیرے ہوتے بیاں — بہ ادائے نوی، بہ نوع دیگر
کیا عجب بڑھ کے میرے ہاتھوں کو — چومتا انوری سا پیغمبر
اور پھر عرض حال یوں کرتا — اے خدا وند، اے کرم گستر
تو ہے قسام عہدہ ہائے جلیل — ڈین شپ کا مدار ہے تجھ پر
ہاتھ میں تیرے وارڈن، پرووسٹ — صدر شعبہ تیرا ہے دست نگر
چشم و آبرو کو دیکھتا ہے تری — مجلس عاملہ کا ہر ممبر
تو نے جب چاہا، جس جگہ چاہا — ہوگئی آسماں سے بارش زَر
اُس کی تنخواہ بڑھ گئی فوراً — پڑ گئی جس پہ تیری ایک نظر
ہم نے بھی دی اس کو مبارک باد — رکھ کے سو من کا قلب پر پتھر
بیوی، بچوں کو یاد کیا — اور ٹھنڈی سی سانس لی بھر کر
پھر دل سفلہ خو کو سمجھایا — مرتبہ مفلسی کا دِکھلا کر
مفلسی ہے صفت اماموں کی — مفلسی سے جنھیں ہوا نہ مفر
جاہ و حشمت سراب عالم ہے — مال و دولت ہے ایک فریب نظر
لے گیا آخرش سکندر کیا ؟ — جب کیا اس نے اس جہاں سے سفر
ہاتھ دونوں کفن سے باہر تھے — پاؤں دونوں کفن کے تھے اندر
کیا کروں عرض حال اے مولا — لب اظہار کھولیے کیوں کر
جانتا ہوں کہ ڈگریوں پر ہے — ان دنوں انحصار علم و ہنر
جانتا ہوں کہ اس نظام میں ہے — قحط سعی جہاد فکر و نظر
جانتا ہوں کہ مصلحت کے سبب — ہو نہ پاؤں گا میں کبھی ریڈر
شومیٔ بخت سے شکایت ہے — کہ جس نے مجھ کو بنا دیا شاعر
ہر ترقی کی راہ کی مسدود — روح فن ہاتھ رہ گئی مل کر
صدرِ شعبہ کے بھی نظر سے گرا — جو تھے مشکل کشائے اہل نظر
نثر جو لکھے گا، بڑھے گا یہاں — ورنہ رہیۓ بطرز میر و جگر
مار دیوان بغل میں میر کی طرح — کہتے پھریۓ کہ میں بھی ہوں شاعر
لوگ دو چار پیسے دے دیں گے — جب سنائے گا تو انہیں گا کر
شاعروں کے لیے ضروری ہے — تلخی زیست سے ہوں شیر و شکر
ورنہ الہام ہوں گے کیسے انہیں — آئے گی جان شعر میں کیوں کر؟
ان دلیلوں کو سن کے جی چاہا — پی لوں آبِ حیات سب جا کر
تاکہ پھر حشر تک فراغت سے — تلخیوں سے رہوں میں زیر و زبر
اور روزِ حساب جب آجائے — تو کہوں شعر بر لب کوثر

جھوم اُٹھیں فرشتگانِ عذاب
داد دے بڑھ کے داورِ محشر

اور پھر حکم ہو کہ اے مرے بندو
شعر کا ذوق کچھ نہیں ہے اگر

منعقد مشاعرہ کر لو
سن لو شاعر کو میرے جی بھر کر

تہہ کرو اپنی فردِ عمل
اب حساب و کتاب ہے کل پر

کیا بتاؤں میں آپ سے آقا
کہ ہوں کس شاخِ بار ور کا ثمر

مجھ کو نسبت ہے میرؔ و سوداؔ سے
میرے مورث ہیں حالیؔ و اکبرؔ

میرے اسلاف غالبؔ و اقبالؔ
میرے اجداد گوئٹے، ہومر

ہیں میری قوم کے سب افراد
ملٹن و ورڈز ورتھ و شکیسپیئر

میرے فرقہ میں حافظ و خیام
اک جہاں کے لیے نشاط آور

پایئے گا مرے قبیلے میں
سعدیوں، پشکنوں کا اک لشکر

محسنوں میں ہے فراقؔ کا نام
سر پرستوں میں میرے جوشؔ و جگرؔ

میرے احباب میں ہیں فیضؔ و مجازؔ
انقلابِ جہاں کے پیغمبر !!

میرے دمساز جعفری و مخدوم
وقت کا رُخ جو موڑ دیں رکھ کر

آپ سمجھیں نہ اس کو لاف وگزار
بات جو سچ تھی آگئی لب پر

لیکن اس مسئلے میں بندہ نواز
صدرِ شعبہ کی رائے ہے دیگر

کیا ثنا و صفت کروں اُن کی
نطق ہوتا نہیں بیاں باور

میرے شعبہ کے کاتبِ تقدیر
میرے استاد اور والا گہر

دیکھیے گر تو پردہ پوشِ عیب
سوچیے گر تو پردہ پوشِ ہنر

مصلحت سے جو بن گئی اک رائے
ہے گویا لکیرِ پتھر پر

میری بابت یہ اُن کا ہے ارشاد
کہ میں شاعر ہوں اور ننگِ بشر

اس میں ایسا ہے رعب حسن تضاد
مارکس کی بھی جھکی ہوئی ہے نظر

پھر بھی آخر ہیں وہ میرے استاد
رائے استاد ہے سر آنکھوں پر

اب تھپیڑے ہیں موجِ طوفاں کے
یعنی شعبہ میں ہوں اِدھر سے اُدھر

آج اس جامعہ میں مجھ سا حقیر
آپ ڈھونڈیں چراغ کو لے کر

احقروں کی بنی ہے جو فہرست
نام میرا سبھوں سے ہے اوپر

دیکھتے ہیں مجھے حقارت سے
کل کے لڑکے بنے ہیں جو ریڈر

کچھ تو بتلایئے کروں میں کیا؟
آسماں گرم ہے، زمیں پتھر

آج کل کیا بتاؤں حال ہے کیا؟
اے مرے والی، اے سخن پرور

شاعری ترک کر کے بیٹھا ہوں
عالمِ شعر میں نہیں ہے گذر

مئے تحقیق سے ہوں خود رفتہ
راہوارِ قلم ہے کاغذ پر

دم اُٹھا کر جو بھاگتا ہے کبھی
روک پاتا نہیں ہوں میں اکثر

الغرض میں جنابِ عالی کی
اپنے بس بھر تو لے رہا ہوں خبر

جب مقالہ چھپے گا تو دیکھیے گا
سارے نقاد ہوں گے زیر و زبر

مجھ سے سرزد ہوئی ہے وہ تنقید
جس کو تنقید بخشے سر تاسر

اسی جھانسے میں لوں گا ڈگری بھی
سند ہوگی جو قابلیت کی !
اس پہ دعوت ضرور دیں گے آپ
آپ کی باتوں سے بھرے گا پیٹ
بعد ازیں گھر پہ منکشف ہوگا
لیکن کھاتا ہوں اب جو نان جوین
اور کہتا ہوں اپنے بچوں سے
خوب تن تن کے کھاؤ نان جوین
دودھ کے واسطے مچاؤ نہ شور
اس سے آجائے گا خودی میں زور
شہر قیصر نے جو بنایا ہے !!
بحر ظلمات میں جو پہنچو گے
اے سخن سنج، اے میرے مالک
بارہا رُک گیا ہے اے حضرت
نہ کہوں آپ سے تو کس سے کہوں؟
آپ ہی پاس ہوتے ہیں گویا
کوستا ہوں بڑے خلوص سے میں
ورنہ مجھ میں صلاحیت وہ تھی
کم سے کم ملتے مجھ کو ڈیڑھ ہزار
اور کرتا بڑی بڑی باتیں
چت بھی میری ہے پَٹ بھی میری ہے
مجھ کو لاکھوں سلام ملتے روز
مجھ کو کہتے ماہر تعلیم
ہائے قسمت کہ کچھ بھی ہو نہ سکا
شعر گوئی کی کاٹتا ہوں سزا
عرضیاں لاکھ دیں، جتائے حقوق
اب تو کر دیجئے معاف خطا
نثر ہی اب لکھوں گا میں
میں نہیں چاہتا محل کوئی !!
مجھ کو مل جائے بس مکان اُن کا
ہاں مری مدتِ غلامی بھی
لیکن اے میری حاجتوں کے کفیل
ہے عجب میرے دل کو اندیشہ
عرض ہے التفات و بخشش وجود

مثل خورشید پھر کروں گا سفر
سکہ بیٹھے گا صدر شعبہ پر
جس میں مجھکو ملے گا تمغۂ تر
ہر نصیحت سنوں گا جی بھر کر
میرے اخلاق بھی گئے ہیں سدھر
اس میں ملتی ہے لذت دیگر
آؤ تم بھی شریک ہو آکر
تم کو سوکھے کا کچھ نہیں ہے ڈر
ہے اسی میں جو ہیں دودھ کے جوہر
اور اُکھاڑو گے تم درِ خیبر
اس کو اک آن میں کروں گا سر
غرق کر دو گے، اسپ و فیل وشتر
تو ہے حاجت روائے نوع بشر
حرفِ مطلب زبان پر آکر
حاجتیں لے کے جاؤں کس در پر؟
جب نہیں ہوتا میری جیب میں زر
اُس گھڑی کو بنا تھا جب شاعر
آج ہوتا کہیں کا چانسلر
رکھتا میں ایک بلکہ دو موٹر
پھر نہ لیتا کسی کی خیر خبر
بحث میں ہوتے میرے وہ تیور
چومتے ہاتھ لوگ جھک جھک کر
مجھ کو سب کہتے قوم کا رہبر
وائے قسمت کے بن گیا شاعر
کہ نہیں ملتا سات سال سے گھر
بحث میں آپ سے چلی نہ مگر
اب کہوں گا کبھی نہ مصرعہ تر
مجھ سے لے لیجیے قسم آکر
جو ہو حکامِ وقت سے بہتر
جو طبیعات میں تھے لیکچرر
اب تو ہے سات سال سے اوپر
اے میرے دادگر، مرے داور
کیا کہیں آپ اس عریضہ پر
غالب خستہ کا نہ دے دیں گھر

سو میں عرض کردوں اے میرے مالک — اس میں دیوار ہے نہ کوئی در
غالب خستہ اک سپاہی تھے — چور، ڈاکوؤں سے تھا نہ اُن کو خطر
رات، دن نشہ میں چلاتے تھے — تیر و توپ و تفنگ و تیغ تبر
اور یہاں ان کے نام سے مولا — دل دھڑکتا ہے، کانپتا ہے جگر
میں نہیں جانتا سپاہ گری — میں ازل سے ہوں آپ کا شاعر
یا تو اب کیجیے مجھے رخصت — یا پھر ہو مرحمت وہی کوارٹر
ختم کرتا ہوں اب گزارش حال — ہوگئے جس میں صرف شام وسحر

بھوک بھی لگ رہی ہے اے مرے آقا
دیکھیں کھانے کو کیا ملے گھر پر

ایک سوگیارہ (۱۱۱) اشعار کے اس شہر آشوب میں لطافت زبان و بیان اور واقعات وتمثیل کے بے شمار نمونے پروئے ہوئے ملیں گے۔ یہ اشعار اگر چہ محض وقتی اور غیر فکری ہیں مگر واقعاتی اور تمثیلی ضرور ہیں۔ اس میں ہجو بھی ہے، عجز بھی ہے اور ملال بھی ہے۔ شکوہ بھی اور اُمید بھی۔ اور یہی اُمید ہر شاعر کا طرۂ امتیاز ہوتا ہے۔ جذبی کو اس اُمید کے سوا اور کیا درکار تھا۔ سال ۲۰۰۵ء میں جذبی کا انتقال ہوا اور مسلم یونیورسٹی قبرستان آخری آماجگاہ قرار پائی۔

سب سے آخر میں جذبی صاحب کی قلمی دستاویز ملاحظہ فرمائیں۔

نام : **معین احسن جذبی**

ولدیت : احسن الغفور

تاریخ پیدائش : ۲۱/اگست ۱۹۱۲ء

مولد : مبارکپور (اعظم گڑھ)

سکونت : ذکاءاللہ روڈ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

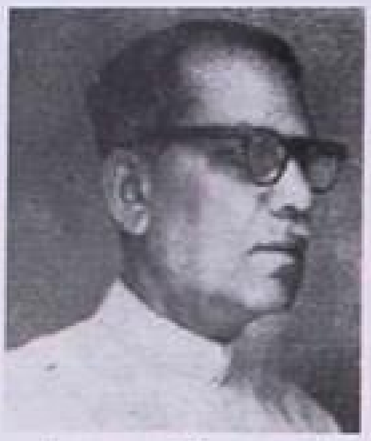
تعلیم : (تفصیل امتحانات معہ سنہ)
جھانسی، آگرہ، لکھنؤ، دہلی اور علی گڑھ میں تعلیم پائی۔
: ہائی اسکول ۱۹۲۹۔ پی ایچ ڈی (علیگ) ۵۶ء

دیگر کوائف : (تصانیف۔ سب سے پہلی غزل، نمونہ کلام وغیرہ)
فروزاں، غزلوں اور نظموں کا مجموعہ۔ سخن مختصر۔ (زیر طبع)
حالی کی شاعری میں سیاسی شعور (زیر طبع، مقالہ پی ایچ ڈی)
حامد شاہ جہاں پوری اور صادق دہلوی سے اصلاح لی

پہلا شعر : ضبط غم بے سبب نہیں جذبی، خلشِ دل بڑھا رہا ہوں میں

آپ اُردو کے کس ادیب سے متاثر ہیں۔ سب سے متاثر ہوں اور کسی سے بھی نہیں۔

دستخط جذبی۔ شہر علی گڑھ
مؤرخہ ۲۱/جون ۵۹ء



علی عباس حُسینی

(۱۸۹۹-۱۹۶۹ء)

حسینی ۱۸۹۹ء میں اپنے وطن پارہ ضلع غازی پور میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۱۹ء میں کیننگ کالج لکھنؤ سے بی۔ اے پھر ۱۹۲۴ء میں ایم۔ اے کیا اور گورنمنٹ جوبلی کالج لکھنؤ میں پروفیسر ہوکر ۱۹۵۴ء میں پنشن لی اور وہیں سکونت اختیار کی۔ علی عباس حسینی افسانہ نگار کی حیثیت سے ایک قابلِ قدر مقام رکھتے ہیں۔ یوں تو انہوں نے ناول بھی لکھے ہیں اور ناول کی تاریخ وتنقید پر بھی قلم اٹھایا ہے مگران کی شہرت افسانہ نویس کی حیثیت سے ہوئی۔ یہ پیدائشی افسانہ نگار معلوم ہوتے تھے۔

علی عباس حسینی اپنا ایک خاص انداز رکھتے، اور افسانہ نگاری کے گُر سے خوب واقف تھے۔ ادبی خوبیوں کے ساتھ زبان میں سادگی اور روانی بھی ہے۔ ان کے افسانے حقیقت پر مبنی ہوتے ہیں اور ہر قسم کی واردات کو ایک خاص انداز سے اُجاگر کرتے ہیں۔ ان کے بعض افسانوں میں درد کی کسک اور تڑپ بھی نظر آتی ہے۔ علی عباس حسینی عہدِ حاضر کے سب سے بہتر افسانہ نگار ہیں۔ ''اُردو کی پری جمال کب پیدا ہوئی۔ اُس نے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں کیونکر کام کیا؟ اس نے کس سن سال میں ہندی کی چندی نکالنا شروع کیا۔ اس کے خرام ناز نے کہاں کہاں گل کترے، اُس نے نظم ونثر کے دشنہ وخنجر سے اپنے کو کس کس طرح سے آراستہ کیا اور اس کی شیریں بیانی نے کن کن عنوانات سے دلوں کو تاخت وتاراج کیا۔ اس رودادِ لطیف کا بیان ہمارے موضوع کے حدود سے باہر ہے۔ ہمیں تو اس سروقد کے صرف اُس حصّے کی کہانی سنانا ہے جسے ''ناول کہتے ہیں۔ ناول کے عناصر ترکیبی سے بھی واقفیت ضروری ہے۔ یہ چار ہیں۔ پلاٹ۔ کردار۔ مکالمہ۔ مناظر۔ لیکن مبصرین ان میں تین کا اور اضافہ کرتے ہیں'' زمان ومکان، نظریہ حیات اور اسلوب بیان'' ''اب رہا مکالمہ تو بے شک وشبہ مولانا نذیر احمد عورتوں کے مکالمے کے بادشاہ ہیں۔

صنفِ نازک کے اندازِ تکلّم، طرزِ گفتگو، نشستِ الفاظ اور روزمرہ محاورہ پر جیسا انہیں عبور ہے، ویسا ''سرشار'' اور مرزا رسوا کے علاوہ کسی کو نصیب نہیں۔ اِن مقامات پر مولانا نے سلاست، روانی اور آمد کے دریا بہادئے ہیں اور (دِلی کی) اتنی ٹکسالی زبان لکھی ہے کہ ہر فقرے پر جی لوٹ پوٹ ہوجاتا ہے۔ مگر جس جگہ پر خود اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں یا مَردوں کی گفتگو لکھی ہے وہاں روانی کا دریا عربی کے ثقیل الفاظ کی چٹانوں سے بار بار ٹکرایا ہے۔ زور وہاں بھی بلا کا ہے۔ بہاؤ میں کمی نہیں، مگر ہاں یہ سبزہ زاروں سے گزرتا ہوا دریا نہیں، بلکہ کوہساروں سے الجھتی ہوئی ندی ہے۔'' ''مناظرِ فطرت وقدرت مرزا رسوا کے ہاں نہ اس بہتات کے ساتھ ہیں جیسے کہ شرر و محمد علی طبیب کے ہاں کہ جی پڑھتے پڑھتے اکتا جائے۔ مرزا (رسوا) کے ہاں لطف یہ ہے کہ بہت کچھ موجود ہے مگر چند جملوں میں اور سب وقت وموقع کے لحاظ سے مناسب، لفظ ایک ترشا ہوا نگینہ ہے کہ جس پہلو سے دیکھئے اُس کا حُسن آنکھوں میں کھُبا جاتا ہے۔'' (ناول کی تاریخ وتنقید ۱۹۴۴ء) فقیر۔ ''ضعیفہ نے پوتے کا ہاتھ تھام لیا اور فقیر کے قریب جاکر بولی۔ ''بابا ہم نے سُنا تھا، تمہیں ایک لڑکا چاہیے فقیر کے لب ولہجہ میں فرق آگیا۔ پہلے عاجزی تھی، اب حکومت۔ وہ بولا تم لائی ہو؟ بڑھیا نے حمید کو اُس کے آگے کر کے کہا۔ ''دیکھو ماشاءاللہ نواں سال ہے۔'' ''اندھے بھکاری نے حمید کو سر سے پاؤں تک اس طرح ٹٹولا جس طرح قصاب بکری کو دام چکاتے وقت ٹٹولتا ہے۔ پھر بولا ہاں مضبوط معلوم ہوتا ہے۔ اندھے نے جھولی سمیٹی اور لکڑی اٹھالی۔ وہ بچے کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہوگیا اور کہا ''چلو پھیری لگائیں۔'' حمید نے دادی کو حسرت سے دیکھا اور اندھے کے آگے آگے چلنے لگا۔ فقیر کا ایک سوکھا ہاتھ بچے کے کاندھے پر تھا اور وہ اُس کے ساتھ صدا لگا رہا تھا۔'' دیدے بابا دیدے۔ ایک ہے، اندھا ایک ہے، بچہ، ایک ہی پیسہ، پاؤ بھر آٹا، دیدے بابا۔'' ایک کی آواز میں خشونت تھی، دوسرے کی آواز میں رقت۔ ایک اپنا حق مانگ رہا تھا، دوسرا حق تلفی کا ماتم کر رہا تھا۔ رحیمن آسمان کی طرف دیکھ کر بولی۔ ''تیرا شکر ہے میرے مالک تو نے میرے بچے کو اتنا خوش قسمت بنایا کہ وہ نویں ہی برس کام پر لگ گیا۔'' (باسی پھول (۱۹۲۹ء)) ''حُسن۔ جس کے پاس ہو، یقینی قیامت ڈھائے، سلطنتیں بنائے اور بگاڑے، سارے عالم سے پُوجا کرائے اور صنم سے خدا بنادے۔'' (رفیق تنہائی۔ ۱۹۳۴ء)

مطبوعات مرتب

۱- غالبِ نامہ

۲- مکالمہ غالب

۳- انشاے خبر

۴- میر غالب کے حریف

۵- حضرت زید شہیدؒ

۶- زیاراتِ عراق

۷- زیاراتِ شام

۸- اکابر بلگرام حصہ اول و دوم

۹- مکالمۂ غالب حصہ دوم (زیرِ طبع)

۱۰- مزامیر (زیرِ طبع)

ملنے کا پتہ

بک سینٹر، ڈگی روڈ، علی گڑھ-202002